﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [سورۃ الاحزاب:۲۱]

”یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ) میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے۔“

سیرتِ نبوی ﷺ

عبرت و نصیحت کا لازوال خزانہ

مصنف

ڈاکٹر مصطفی سباعی رحمہ اللہ

مترجم

مزمل حسین فلاحی (علیگ)

مراجعہ و تقدیم

فضیلۃ الشیخ ابو عدنان محمد منیر قمر حفظہ اللہ

توحید پبلیکیشنز، بنگلور (انڈیا)

سیرتِ نبوی ﷺ

عبرت و نصیحت کا لازوال خزانہ

مصنف

ڈاکٹر مصطفی سباعی رحمہ اللہ

مترجم

مزمل حسین فلاحی (علیگ)

تقدیم

فضیلۃ الشیخ ابو عدنان محمد منیر قمر حفظہ اللہ

ناشر

توحید پبلیکیشنز

بنگلور (انڈیا)

کتاب ---------- سیرتِ نبوی ﷺ عبرت و نصیحت کا لازوال خزانہ

تالیف ---------- ڈاکٹر مصطفی سباعی رحمہ اللہ

تقدیم ---------- فضیلۃ الشیخ ابو عدنان محمد منیر قمر حفظہ اللہ

طبع اوّل ---------- 1435ھ...... 2014ء

کمپوزنگ ---------- محمد حسن خان 0322 4382203

تعداد ---------- 3000

ناشر ---------- توحید پبلی کیشنز، بنگلور انڈیا

ہندوستان میں ملنے کے پتے

1-Tawheed Publications
Contact:Mr.M.R.Khan,S.R.K.Garden,
Phone#9900446193
BANGALORE-560 041
2-Charminar Book Center
Charminar Road,Shivaji Nagar,
BANGALORE-560 051
3-Dar us Salaam,
Hanif Ahmed Wani,
SRINAGAR(Jammu Kashmir)
Phone#9419748245
4-Maktaba As-Sunnah,
Mohammed Najeeb Bakhali,
Bhendi
Bazar,Phone#8097444448
MUMBAI(Maharastra)

1- توحید پبلیکیشنز
رابطہ: محمد رحمت اللہ خان، ایس.آر.کے.گارڈن،
فون: ۹۹۰۰۴۴۶۱۹۳، بنگلور۔۵۶۰ ۰۴۱
2- چارمینار بک سنٹر،
چارمینار روڈ، شیواجینگر، بنگلور۔۵۶۰ ۰۵۱
3- دارالسلام کشمیر
حنیف احمد وانی، فون: ۹۴۱۹۷۴۸۲۴۵
سری نگر۔(جموکشمیر)
4- مکتبہ السنّہ
محمد نجیب بقالی، فون: ۸۰۹۷۴۴۴۴۴۸
بھینڈی بازار، ممبئی

Email tawheed_pbs@hotmail.com

فہرستِ مضامین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

تقدیم

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ ، نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَسَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ تاللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَاهَادِيَ لَهٗ ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ . أَمَّا بَعْـــــدُ:

معزز قارئینِ کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

''سیرتِ نبوی-عبرت ونصیحت کا لازوال خزانہ''معروف عرب مصنّف علامہ ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی رحمہ اللہ مؤلف ''اسلام میں سنّت کی آئینی حیثیّت'' جیسی مشہور ومفید کتب کے مؤلف ہیں۔انہوں نے اس کتاب کو سیرت سے ان متعلقہ اپنے بعض لیکچرز سے مرتب کیا ہے جو دمشق یونیورسٹی کے شریعت کالج میں دیئے گئے تھے۔

اسکا اردو ترجمہ جناب مزمل حسین فلاحی (علیگ) نے کیا ہے اور یہ اس سے قبل بعض مقامات (مثلاً الجیل دعوۃ سنٹر) سے شائع ہوچکی ہے،لیکن لگتا ہے کہ جوں کی توں (As it is) ہی چھپی،اس پر مناسب محنت تو کیا معمولی نظرِ ثانی بھی نہیں کی گئی تھی۔

اب ''توحید پبلیکیشنز'' بنگلور کی طرف سے اپنے قارئین کی خدمت میں پہلے سے بہت بہتر انداز سے پیش کیا جارہا ہے، کیونکہ موجودہ ایڈیشن میں ہم نے بعض خدمات سرانجام دی ہیں جن سے کتاب کا افادہ بڑھ جائے گا۔ان شاء اللہ،مثلاً:

:...... بکثرت مقامات پر نبی کریم ﷺ پر اور دیگر انبیاء علیہم السلام پر درودوسلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے رضائے الٰہی کی اور تابعین وآئمہ کیلئے رحمت کی دعاء کسی وجہ سے رہ گئی تھی،وہ شامل کردی ہے تاکہ قارئینِ کرام کے اجر وثواب میں بھی اضافہ ہو۔

۲:...... بعض جگہوں پر ترجمہ کرتے وقت یا کمپوزنگ کے دوران عبارات میں کچھ جھول سارہ گیا تھا جو واضح طور پر محسوس ہوتا تھا، اُس کی اصلاح کردی ہے۔

۳:...... بعض مقامات پر پرانے لغوی انداز سے ''کے اندر'' استعمال کیا گیا تھا جو صرف لفظ ''میں'' سے بہتر معنیٰ ادا کرتا ہے۔لہٰذا یہ تبدیلی کردی گئی ہے۔

۴:...... خدا، بخدا، خدائے تعالیٰ کی بجائے لفظِ جلالت ''اللہ'' زیادہ صحیح ہے لہٰذا یہ اصلاح بھی کردی ہے۔

۵:......احادیث کی تخریج کا کوئی اہتمام نہیں تھا جو اس ایڈیشن میں آپ دیکھ سکیں گے۔

۶:...... بعض جگہوں پر مناسب ومفید حواشی لگا دیئے گئے ہیں۔

۶:...... کہیں کسی بغلی سرخی کا وجود مناسب تھا لہٰذا وہ لکھ دی گئی ہے۔

۸:...... کتبِ تاریخ وسیر میں سے بھی کسی کا حوالہ نہیں تھا جو کہ ضروری مقامات پر درج کردیئے گئے ہیں۔حتیٰ کہ بعض کتب اگرچہ مؤلف کے پیشِ نظر نہ تھیں مگر یہ مواد وہاں موجود ہے، لہٰذا قارئینِ کرام کے استفادے کے لیے انکا ذکر کردیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف ومترجم، مقدِّم اور ناشرین کی اس محنت کو قبول فرمائے اور اسے قارئینِ کرام کے لیے باعثِ استفادہ بنائے۔ آمین

الخبر ، بروزِ چہار شنبہ — والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

۸/۷/ ۱۴۳۵ھ — ابوعدنان محمد منیر قمر

۷/۵/ ۲۰۱۴ء — ترجمان سپریم کورٹ، الخبر

وداعیہ متعاون مکاتب جالیات الخبر ،

الراکۃ ، الدمام ، الظہران (سعودی عرب)

www.mohammedmunirqamar.com

پیش رس

--از مصنف--

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَرْسَلَ رُسُلَہٗ بِالْبَیِّنَاتِ وَالْھُدٰی لِیُخْرِجُوْا النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ وَیَھْدُوْھُمْ اِلٰی صِرَاطِ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ.

وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَفْضَلِ رُسُلِہٖ وَاَشْرَفِ دُعَاتِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ.

تمام تعریفیں اُس اللہ کے لیے جس نے اپنے رسولوں کو واضح تعلیمات اور ہدایت کے ساتھ اس لیے بھیجا تا کہ وہ عوام کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں اور اللہ رب العزت و بزرگ و برتر کی سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کریں۔

اور درود و سلام ہو اس کے افضل رسول پر، معزّز داعی سیدنا محمد ﷺ پر جن پر اللہ نے اپنے رسولوں کی آمد کا سلسلہ ختم کیا۔ زندگی کے چھوٹے بڑے تمام معاملات میں آپ ﷺ کی سیرت کو تمام مسلمانوں کے لیے اُسوہ قرار دیا، آپ ﷺ کے دین پر تمام شریعتوں کا اتمام کیا اور آپ ﷺ کے پیغام کو مکمل ترین پیغام اور ہر دَور اور ہر ماحول میں انسانوں کی ضروریات کی تکمیل کرنے والا بنا دیا۔ آپ پر اور آپ کے ان پاکباز ہدایت یافتہ ساتھیوں پر درود و سلام ہو جن کے اندر اللہ نے فطری سلامت، عقیدہ کی سچائی اور پختگی، قربانی کا جذبہ پایا اور انہیں اِس سرزمین کی تمام اقوام تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا ذمہ دار بنایا چنانچہ انہوں نے اس راہ میں اپنے خون بہا دیئے، اس کی خاطر اپنے گھر بار چھوڑے یہاں تک کہ امانت

کا حق ادا کر دیا، ذمہ داری پہنچادی، اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کی اور آج پوری انسانیت پر اُن کا بے حد وحساب احسان ہے۔ اور ہر مسلم کی گردن ان کے بارِ احسانات سے قیامت تک دبی ہوئی رہے گی ان پر اور ان مسلمانوں پر بھی اللہ کی خوشنودی سایہ فگن ہو جو ان سے محبت کریں اور قیامت تک دعوتِ دین کا پرچم بلند کرتے رہیں۔

یہ کچھ یادداشتیں ہیں جنہیں میں نے جلدی میں مرض کی شدت کی حالت میں تحریر کیا جبکہ انہیں مفصل انداز میں شریعت کالج دمشق یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے پیش کر چکا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ رسولِ کریم ﷺ کی سیرت کے اسوہ کے مظاہر کو نمایاں کروں جن پر غور کرنا اور جنہیں اپنے سامنے رکھنا ہر مسلمان اور داعی الی اللہ پر واجب ہے تا کہ رسول ﷺ کی اقتداء اور پیروی کا اسے شرف حاصل ہو سکے، اس کے سامنے عوام کے درمیان دعوت کی کامیابی اور اللہ کے نزدیک اس کی مقبولیت اور پسندیدگی کا راز وا ہو سکے اور جنّاتِ نعیم میں اسے خلود کی زندگی میسر آ سکے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ (سورۃ النساء : ۱۳)

''جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا' اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔''

میں نے مندرجہ ذیل انداز میں اپنی گفتگو مکمل کی ہے:

الف:......ایک مقدمہ ہے جو دو بحثوں پر مشتمل ہے:

① ......سیرتِ نبوی ﷺ کی خصوصیات اور اس کے مطالعہ کا فائدہ۔

② ......سیرت کے صحیح مآخذ اور مراجع۔

ب:......آپ کی سیرت کا فہم جو دس فصلوں پر مشتمل ہے:

❁:......پہلی فصل: بعثت سے پہلے آپ کی زندگی پر مشتمل ہے:

❁:......دوسری فصل: بعثت سے لے کر ہجرتِ حبشہ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

❁:......تیسری فصل: ہجرتِ حبشہ سے ہجرتِ مدینہ تک کی زندگی پر حاوی ہے۔

❁:......چوتھی فصل: ہجرت اور مدینہ میں آپ ﷺ کے استقرار و قیام پر حاوی ہے۔

❁:...... پانچویں فصل میں غزوۂ بدر سے فتح مکہ تک کے تمام غزوات کا حال بیان کیا گیا ہے۔

❁:......چھٹی فصل میں فتحِ مکہ کے بعد جزیرہ عرب میں اسلام کی اشاعت پر گفتگو کی گئی ہے

❁:......ساتویں فصل میں فتحِ مکہ کے بعد وفات تک کی زندگی مذکور ہے۔

❁:......آٹھویں فصل میں مدینہ کے اسلامی قوانین کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

❁:......نویں فصل آپ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ اور مستشرقین اور عیسائی مشنریوں کی افتراء پردازیوں کے بیان پر مشتمل ہے۔

❁:...... دسویں فصل میں آپ ﷺ کی زندگی اور آپ ﷺ کے پیغام کے عالم گیر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اللہ سے دعاء ہے کہ اِس جلدی میں جو تحریریں ظہور میں آ گئی ہیں اور جس میں سیرتِ نبوی پر غور و فکر کا مجھے موقع میسّر آیا ہے، اس سے اصل مقصد پورا ہو سکے اور طلبہ و طالبات کے اندر سیرت نبوی کے مطالعہ کی رغبت پیدا ہو سکے اور وہ اس کے معانی و حقائق کو اپنی زندگی کی تعمیر اور اصلاحِ احوال کے لیے اُسوہ اور نمونہ بنا سکیں اور اصلاح و تبلیغ کی دعوت میں اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں، یہاں تک کہ مسلمانوں کے لیے رسول ﷺ کی زندگی آفتابِ ضیابار بن جائے، جو ان کی زندگی کی تاریکیوں کو چھانٹ دے، ان کے دلوں، دماغوں اور سلوک و برتاؤ میں حرارت اور گرمی پیدا ہو سکے اور اِسلامی معاشرہ کی تابنا کی و

استقامت اور اس کا آئیڈیل کردار بازیافت ہو سکے تاکہ وہ پھر ایک دُنیا کی معلّمی و رہبری کے فرائض انجام دے سکے اور ہم مسلمانوں کے سلسلہ میں اللہ کا یہ ارشاد ایک بار صحیح ثابت ہو جائے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ (سورة آل عمران : ١١٠)

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

دمشق ۱۳۸۱ھ

مصطفى السّباعى

آغازِ کتاب

سیرتِ نبوی ﷺ کی خصوصیات

سیرتِ نبوی ﷺ کی متعدد خصوصیات ہیں جن کے مطالعہ سے روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے، عقل کو جلا ملتی ہے اور تاریخی واقعات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے' یہ مطالعہ علماءِ شریعت، داعیانِ دین و اجتمائی و سماجی مصلحین کے لیے از حد ضروری ہے تا کہ دعوت و تبلیغ کا کام اس انداز سے کریں کہ عوام مشکلات و مسائل اور دکھوں اور پریشانیوں کا واحد علاج اسلام ہی کو سمجھنے لگیں، داعیوں کے سامنے عوام کے دل و دماغ دا ہو سکیں اور جس اصلاح کی طرف مصلحین دعوت دے رہے ہیں اس کی کامیابی و سرخروئی یقینی ہو سکے۔ ہم ذیل میں سیرتِ نبوی ﷺ کی چند خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں:

پہلی خصوصیت:

یہ ہے کہ یہ نبی مُرسل یا ایک عظیم ترین مصلح کی تاریخ کی صحیح ترین سیرت ہے۔ سیرتِ رسول ﷺ ہم تک صحیح ترین علمی طریقوں اور مدلل اور ثابت انداز میں پہنچی ہے۔ جیسا کہ ہم سیرت کے مآخذ کی بحث میں مطالعہ کریں گے۔ جس سے اس سیرت کے نمایاں واقعات اور اہم حالات کی صداقت میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا اور اس سے ان مصنوعی واقعات، اضافی معجزات یا جھوٹے حالات کی قلعی بھی کھل جاتی ہے جنہیں جاہل افراد نے رسول کریم ﷺ کی طرف منسوب کر دیا کہ ان کی نگاہ میں رسول ﷺ کی جلالتِ قدر، رسالت کا عظیم مرتبہ اور سیرت کی دل آویز شخصیت اسی کی متقاضی تھی۔

یہ خصوصیت ایک ایسی صداقت ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور یہ صفت اللہ کے دوسرے انبیاء اور رسولوں علیہم السلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی سیرت صحیح ڈھنگ میں آج موجود نہیں ہے کیونکہ علماءِ یہود نے اس میں تحریف و ترمیم کردی اور آپ علیہ السلام کی سچی سیرت کا پتہ لگانے کے لیے موجودہ تورات کا سہارا بھی نہیں لیا جا سکتا۔ بہتیرے مغربی نقادوں نے اس کے بعض اسفار میں شکوک وشبہات ظاہر کیئے ہیں اور بعض نقادوں کا تو قطعی طور سے کہنا ہے کہ بعض اسفار موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں نہیں لکھے گئے نہ آپ کے بعد قریبی زمانے میں انہیں ترتیب دیا گیا بلکہ عرصۂ دراز کے بعد انہیں لکھا گیا اور مصنف بھی نامعلوم ہے۔ صرف یہی بات موسیٰ علیہ السلام کی سیرت کی صحت وصداقت میں شبہ پیدا کرنے کے لئے کافی ہے اسی لئے ایک مسلمان کے سامنے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی سیرت کے اسی حصّے کو صحیح تسلیم کرے جو قرآنِ کریم اور صحیح احادیث میں وارد ہوا ہے۔

یہی گفتگو عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت کے بارے میں بھی کی جا سکتی ہے۔ مسیحی کلیسا کے نزدیک سرکاری طور پر جس مجموعے کو انجیل کہا گیا اور تسلیم کیا گیا ہے وہ عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے صدیوں بعد آخری دور میں ترتیب دیا گیا اور بغیر کسی علمی معیار کے اس وقت سینکڑوں انجیل کے نسخے جو مسیحیوں کے درمیان پھیلے ہوئے تھے، ان کا انتخاب ہے پھر ان انجیلوں کا ان کے مصنّفین سے تعلق کسی اطمینان بخش علمی طریقہ سے ثابت نہیں ہے۔ ان کی روایت کسی ایسی سند سے ثابت نہیں ہے جو ان مصنّفین تک پہنچتی ہو، اسی طرح ان مصنّفوں کے بارے میں مغربی نقادوں میں خاصا اختلاف ہے کہ وہ کون لوگ تھے اور کس زمانے کی پیداوار تھے؟

جب دنیا کے مختلف مذاہب کے حاصل انبیاء اور رسولوں کی سیرتوں کا یہ حال ہے تو ان دوسرے نظریات اور فلاسفہ کی سیرتوں میں تو اور زیادہ شک و شبہ پیدا ہوگا جن کے پیروکار لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جن روایتوں کو ان کے پیروکار سینہ بہ سینہ نقل کرتے ہیں ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔ مثال کے طور پر بدھ اور کنفیوشس کو

لے لیجئے، جس کا ہنوں کی من گھڑت کہانیاں ملتی ہیں، کچھ خرافات اور قصّے ہیں جو نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے ہیں، جنہیں عصبیّت سے آزاد روشن عقل کبھی صحیح باور نہیں کر سکتی۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صحیح ترین سیرت اور مدلّل علمی اور تواتر کی حد تک صداقت کو پہنچی ہوئی زندگی بس محمد ﷺ کی زندگی ہے۔

دوسری خصوصیت:

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اپنے تمام مراحل میں پوری طرح واضح ہے۔ والد عبداللہ کی، والدہ آمنہ سے شادی سے لے کر آپ ﷺ کی وفات تک پوری حیاتِ مبارکہ معروف اور ظاہر و باہر ہے۔ ہم آپ کی ولادت، طفولیت، شباب، نبوّت سے پہلے کے روزگار اور کمائی، مکہ کے باہر اس مقصد کے لیے آپ ﷺ کا سفر کرنا، پھر نبوّت سے سرفراز کیا جانا، سارے حالات اچھی طرح جانتے ہیں، پھر اس کے بعد سال بہ سال مکمل حالات نہایت واضح اور نمایاں شکل میں ہمارے سامنے ہیں جس سے آپ ﷺ کی سیرتِ آفتاب سے زیادہ ضیا بار اور ضوفشاں ہو جاتی ہے جیسا کہ کسی مغربی تنقید نگار نے کہا ہے کہ،

''محمد (ﷺ) وہ پہلے شخص ہیں جو سورج کی روشنی میں پیدا ہوئے تھے۔''

اس کی مثال کسی دوسرے رسول کی زندگی میں نہیں ملتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی طفولیت، شباب اور نبوت سے پہلے کی معیشت اور زندگی کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور نبوت سے بعد کی زندگی کے بارے میں کچھ معلومات ملتی بھی ہیں تو ان سے آپ علیہ السلام کی شخصیت کی مکمّل تصویر سامنے نہیں آ پاتی۔ اسی طرح کی بات عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ہمیں ان کی زندگی کے بارے میں ان چیزوں کے سوا کچھ مزید معلوم نہیں جن کا تذکرہ موجودہ انجیلیں کرتی ہیں کہ آپ یہودیوں کے ہیکل میں داخل ہوئے اور ان کے احبار و رہبان سے مباحثہ کیا۔ یہی وہ تنہا واقعہ ہے جو آپ کی طفولیت کے بارے میں ان انجیلوں میں ملتا ہے۔ پھر نبوّت کے بعد بھی آپ علیہ السلام کی زندگی کے وہی گوشے ہمیں معلوم ہیں جو آپ علیہ السلام کی

دعوت سے متعلق ہیں اور معیشت اور زندگی سے متعلق تھوڑی سی تفصیل بھی مل جاتی ہے اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے مسائل و معاملات پر زبردست کہر چھائی ہوئی ہے۔

بھلا ان سیرتوں کا آپ ﷺ کی سیرتِ مبارک سے کیا مقابلہ، جس کی مکمل تفصیلات ہمارے سامنے ہیں۔ نجی زندگی، اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، لباس، شکل وصورت، ہیئت، گفتگو، خاندان کے لوگوں سے معاملہ اور برتاؤ، عبادت ونماز، دوستوں کی صحبت و معاشرت غرضیکہ پوری زندگی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے بلکہ آپ ﷺ کی سیرت کے راویوں کی دقّتِ نظر اور محنت اتنی آگے ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ کے سرِ مُبارک اور داڑھی کے بال تک گن ڈالے ہیں۔

تیسری خصوصیت:

اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت ایک ایسے انسان کی سیرت ہے جسے اللہ نے رسالت سے نوازا تھا، لیکن یہ سیرت انسانیت کے دائرے سے باہر ہے نہ اساطیر وخرافات سے اس کا کوئی تعلق ہے، نہ اس میں کم یا بیش الوہیت کا اضافہ اور پیوند کاری ہے۔ جب اس چیز کا مقابلہ ہم ان روایات سے کرتے ہیں جن میں مسیحیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت بیان کی ہے، اور جو بدھسٹوں نے بدھ کے متعلق لکھا ہے اور بت پرستوں نے اپنے معبودانِ باطلہ کے بارے میں روایت کی ہے، تو آپ ﷺ کی سیرت اور ان لوگوں کی سیرت میں واضح فرق ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ اس کے دُوررس اثرات ان کے پیروکاروں کی انسانی و اجتماعی زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام اور گوتم بدھ کے لیے اُلوہیت کے دعوے اُنہیں انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے نمونہ نہیں چھوڑتے جبکہ محمد ﷺ کی زندگی ہر اس انسان کے لیے مکمل انسانی نمونہ اور اُسوہ ہے جو خود شرافت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور اپنے خاندان اور ماحول میں پاکیزہ رہنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ (سورۃ الاحزاب: ٢١)

''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخرت کا امیدوار ہو۔''

چوتھی خصوصیت:

رسول اللہ ﷺ کی سیرت انسان کے تمام گوشوں اور دائرؤں پر محیط ہے۔ یہ ہمارے سامنے اس نوجوان کی زندگی لاتی ہے جو رسالت سے پہلے راست رو، امانت دار کی حیثیت سے معروف تھا۔ اس رسول کی حیات ہمارے سامنے رکھتی ہے جو اللہ کی دعوت دیتا تھا اور اپنی دعوت کی محبوبیت ومقبولیت کے لیے بہترین وسائل اختیار کرتا تھا اپنے پیغام کو پہچانے میں انتہا درجہ کی طاقت اور صلاحیت اور محنت صرف کرتا تھا۔ اسی طرح ہمارے سامنے ایک ایسی صدرمملکت کی تصویر آتی ہے جو اپنی مملکت کے لیے بہترین اور صحیح ترین انتظام کرتا تھا اور اپنی بیداری و ہوشمندی، اخلاص وصداقت کے ذریعہ اس کی حفاظت کرتا تھا، جس سے اس کی کامیابی یقینی ہو جاتی تھی۔ اسی طرح ہمارے سامنے ایک ایسے نبی کی زندگی ہے جو شوہر تھا باپ تھا شفقت و محبت کا پیکر، معاملات کا درست، شوہر بیوی، بچوں کے تمام حقوق و واجبات کی تمیز کرنے والا تھا ایسا رسول جو مرشد تھا مُربّی تھا، اپنے ساتھیوں کی ایسی مثالی تربیت کرتا تھا کہ اپنا دل ان کے دلوں میں اتار دیتا اور اپنی روح ان کی ارواح میں جاگزیں کر دیتا تھا جس کی وجہ سے چھوٹے بڑے تمام معاملات میں اس کی اقتداء کرتے تھے۔ بہترین دوست جو صحبت ومعاشرت کی ذمہ داریاں پہچانتا اور انہیں اچھی طرح ادا کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کے ساتھی، اس سے اپنی جان سے زیادہ محبت کرتے تھے، اپنے اہل و عیال اور اعزّہ و اقرباء سے زیادہ اسے محبوب رکھتے تھے۔ ایک جنگجو بہادر اور سورما، ایک فتحیاب لیڈر، کامیاب سیاسی قائد، امانت دار تاجر اور سچا معاہدہ کرنے والا، غرضیکہ اللہ کے رسول کی سیرت تمام انسانی گوشوں کو محیط ہے اور ہر داعی، ہر لیڈر، ہر باپ، شوہر، دوست، مربّی، سیاست داں، صدرمملکت وغیرہ کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

ہم اس درجہ کی یا اس سے ملتی جلتی جامعیت ہ ہمہ گیریت دوسرے رسولوں کی سیرتوں متقدمین ومتاخرین فلاسفہ اور اصحابِ نظریہ کی زندگیوں میں نہیں دیکھتے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ایک قومی لیڈر کی زندگی ہے جس نے اپنی قوم کو غلامی کے جوے سے نکالا اور اس کے لیے ایسے قواعد و اصول وضع کئے جو بس اسی قوم کی اصلاح کر سکتے تھے، لیکن ان کی سیرت میں میدانِ جنگ کے سورماؤں، مربیوں، سیاست دانوں، صدورِ مملکت یا باپوں یا شوہروں کے لیے کوئی نمونہ نہیں ملتا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام ایک عابد و زاہد داعی کی نمائندگی کرتے ہیں، جس نے دنیا سے کوئی سروکار نہ رکھا اور جو مال و دولت، گھر بار، اسباب و سامان سے بالکلّیہ بے نیاز تھا لیکن مسیحیوں کے ہاں ان کی جو سیرت موجود ہے اس میں کسی جنگجو بہادر، کسی لیڈر، کسی صدرِ مملکت، باپ، شوہر یا قانون ساز کے لیے کوئی رہنمائی نہیں ملتی ہے۔ یہی حال گوتم بدھ، کنفیوشس، ارسطو، افلاطون، نابلیون اور تاریخ کے دوسرے ہیرؤوں کا ہے، یہ لوگ نمونہ اور اسوہ نہیں بن سکتے۔ بس زندگی کے کسی ایک گوشے میں یہ نمایاں ہوئے اور اس میں شہرت پائی۔ وہ تنہا انسان جو تمام طبقوں اور گروہوں کے لیے نمونہ بن سکتا ہے اور تمام صلاحیتوں والے افراد اور جماعتوں کے لیے اُسوہ پیش کرسکتا ہے بس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہے۔

پانچویں خصوصیت:

یہ تنہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے جو ہمیں ایسی دلیل فراہم کرتی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور نبوت کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں باقی رہنے دیتی۔ یہ ایک انسانِ کامل کی سیرت ہے، جو اپنی دعوت کو لے کر مرحلہ وار آگے بڑھا۔ معجزات وخوارق کے بل پر نہیں بلکہ طبیعی اور حتمی طریقے سے سارے مراحل طے کئے۔ دعوت دی تو ستائے گئے۔ تبلیغ کی اور انصار و اعوان کی جمعیت فراہم ہوئی۔ جنگ پر مجبور ہوئے تو اس سے بھی دریغ نہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت حکمت و بیدار مغزی کا شاہکار تھی، چنانچہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی ہے آپ کی دعوت قہر وغلبہ کے زور سے نہیں بلکہ ایمان وعمل کے راستے سے پورے جزیرۂ عرب

پر چھا چکی تھی۔ جس شخص کو عربوں کے عادات و عقائد معلوم ہیں رسول اکرم ﷺ کی انہوں نے جس طرح مخالفت کی، آپ کو قتل کرنے کی جو سازشیں رچی گئیں، ہر معرکہ میں افراد اور اسلحہ کی کمی کے باوجود آپ کو جس طرح فتح نصیب ہوئی، صلح اور معاہدوں کو تا وفات آپ ﷺ نے جس طرح نبھایا اور تئیس سال کی قلیل مدّت میں جس طرح آپ ﷺ کی دعوت پھیلی، یہ ساری باتیں جو شخص جان لے وہ یہ یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول تھے۔ اور آپ کو جو قوّت و طاقت، صبر و ثبات اور فتح و تاثیر دی گئی تھی وہ اس وجہ سے دی گئی تھی کہ آپ درحقیقت اللہ کے نبی تھے اور یہ کہ جو شخص جھوٹا ہو اُس کی اِس طرح منفرد و یگانہ تائید اللہ تعالیٰ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت نہایت عقلی انداز میں اپنی نبوت کی صداقت و حقانیت ثابت کرتی ہے۔ اور جو معجزات آپ ﷺ سے صادر ہوئے، وہ عربوں کے ایمان و اسلام کی اوّلین محرک نہیں تھے بلکہ ہمیں کوئی ایسا معجزہ نظر نہیں آتا جس کی وجہ سے دشمن کافروں نے سپر ڈال دیا ہو، پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ مادّی معجزات بس دیکھنے والوں کے خلاف یہی حجّت بن سکتے ہیں اور یہ بالکل قطعی اور طے شدہ ہے کہ جن لوگوں نے نبی ﷺ کو نہیں دیکھا، نہ آپ ﷺ کے معجزات کا مشاہدہ کیا وہ محض صدقِ نبوت کے عقلی و قطعی دلائل کی وجہ سے آپ پر ایمان لائے اور ان عقلی دلائل میں سرِ فہرست قرآنِ کریم ہے۔ یہ کتاب ایک عقلی معجزہ ہے جو ہر انصاف پسند اور صاحبِ عقل کو اس امر پر مجبور کر دیتی ہے کہ محمد ﷺ کی صدق و سچائی اور نبوت و رسالت کی صداقت پر ایمان لائے۔

یہ تمام سابق انبیاء کی سیرتوں سے قطعی مختلف ہے۔ ان کی سیرتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ عوام ان پر ایمان اسی وقت لائے جب ان کے ہاتھوں انہوں نے معجزات و خوارق دیکھ لیے ان کی دعوت کے اصولوں اور قواعد کی صداقت میں اُنہوں نے عقل کے فیصلہ کو حکَم نہیں مانا اور اس کی واضح ترین مثال عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت ہے۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ یہودیوں کو اپنی رسالت کی صداقت پر مطمئن کرنے کے لیے وہ

مریضوں کو شفا دیتے تھے، مردوں کو زندہ کرتے تھے اور کوڑھیوں اور برص کے بیماروں کو ٹھیک کرتے تھے اور یہ سب محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے اذن سے ہوتا تھا اور موجودہ اناجیل بھی ہمیں بتاتی ہیں کہ تنہا معجزات ہی عوام کے آپ پر ایمان لانے کا سبب بنے۔ لوگ اس وجہ سے ایمان نہیں لائے کہ وہ رسول ہیں جیسا کہ قرآن کا بیان ہے بلکہ اس وجہ سے انہیں سچا تسلیم کیا کہ وہ نعوذ باللہ-اللہ اور اس کے بیٹے ہیں اور مسیح علیہ السلام کے بعد مسیحیّت پر اس کے پیروکار ایمان لائے، اس کی بنیاد عقلی اطمینان کے بجائے معجزات و خوارق پر ہے۔ یہیں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں یہ خوبی کتنی نمایاں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی ایک فرد بھی معجزہ یا خارقِ عادت کسی چیز کو دیکھ کر ایمان نہیں لایا بلکہ جو لوگ بھی مسلمان ہوئے عقل و وجدان کے اطمینان کے ذریعہ ہی مسلمان ہوئے۔ اللہ نے اپنے آخری رسول کو جو معجزات بھی عطا کئے وہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکرام و تعظیم کے لیے اور مخالفین و معاندین کے خلاف اتمامِ حجت کے لیے تھے۔ جو شخص قرآن کا مطالعہ گہرائی سے کرے گا وہ یہ محسوس کرے گا کہ اس کتاب نے اطمینان و سکون بخشنے کے لیے عقلی محاکمہ، قدرت کی کاریگری کا محسوس مشاہدہ اور مکمّل معرفت کا سہارا لیا ہے، کیونکہ رسولِ اُمّی تھے اور اس اُمیت کو قرآن نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت پر دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے:

﴿وَقَالُوا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَإِنَّمَآ أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّآ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ ۝﴾

(سورة العنكبوت: ٥٠، ٥١)

”یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اُتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے؟ کہو نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا

ہوں کھول کھول کر۔'' اور کیا اِن لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔''

اور جب کفّارِ قریش نے اقوامِ ماضیہ کی طرح معجزات کا مطالبہ کیا تو اللہ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ جواب میں کہیں:

﴿سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝۹۳﴾ (سورۃ بنی اسرائیل:۹۳)

''پاک ہے میرا پروردگار، میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور کچھ نہیں ہوں؟''

اسی سورہ کی یہ آیت پڑھیے:

﴿وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝۹۰ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝۹۱ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝۹۲ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝۹۳﴾

(سورۃ بنی اسرائیل : ۹۰ تا ۹۳)

''اور انہوں نے کہا: ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کردے یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہوا اور تو اس میں نہریں رواں کردے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرادے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا اللہ اور فرشتوں کو رو، در رو، ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے، اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک

کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اُتار لائے جسے ہم پڑھیں"............اے نبی! ان سے کہو: "پاک ہے میرا پروردگار، میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوں؟"۔

اسی طرح قرآن پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ محمد ﷺ انسان ہیں، رسول ہیں اور یہ کہ رسالت کے دعوے میں معجزات و خوارق پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تو عقلوں اور دلوں کو مخاطب بناتا ہے:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

"پس جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔"

سیرتِ نبوی ﷺ کے مآخذ

سیرتِ نبوی ﷺ کے چار قابلِ اعتماد مراجع اور مآخذ ہیں:

(ا) قرآنِ حکیم:

یہ وہ اولین مآخذ ہے جس سے ہم سیرتِ نبوی ﷺ کی جھلکیاں اخذ کر سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی سے بحث کی ہے:

﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝﴾

(سورۃ الضحی: ٦ تا ٧)

"کیا اُس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟ اور تمہیں ناواقفِ راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی۔"

اسی طرح آپ ﷺ کے بلند اخلاق کا بھی ذکر کرتا ہے:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ (سورۃ القلم: ٤)

"اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔"

قرآن پاک میں ان تمام مصیبتوں اور آلام کا ذکر ہے جو آپ ﷺ کو دعوت کی راہ میں پیش آئے اسی طرح مشرکین نے اللہ کی راہ سے بندگانِ الٰہی کو روکنے کے لیے آپ ﷺ پر جنون، دیوانگی اور سحر و کہانت کے جو الزامات لگائے تھے، ان کا تذکرہ بھی قرآن میں موجود ہے۔ اس کتاب نے ہجرتِ رسول سے تعرّض کیا اور ہجرت کے بعد جو جنگیں آپ ﷺ نے لڑی ہیں، ان کا بھی ذکر کیا چنانچہ جنگِ بدر، جنگِ اُحد، جنگِ احزاب، صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوہ حنین پر تبصرے کیئے اور بعض معجزات جیسے لیلۃ الاسراء اور معراج کو بھی بیان کیا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ سیرتِ رسول ﷺ کے بیشتر واقعات پر اس نے گفتگو کی اور چونکہ قرآنِ پاک اس رُوئے زمین کی سب سے زیادہ معتمد کتاب ہے اور متواتر ثبوت اور دلائل کی روشنی میں کوئی عاقل انسان اس کے نصوص اور تاریخی ثبوت و دوام اور حفاظت کے بارے میں شک نہیں کرسکتا، اس لیے اس میں سیرت کے جن واقعات و حالات سے بحث کی گئی ہے وہ بالعموم سیرت کے صحیح ترین واقعات اور یہ کتاب سیرت کا اوّلین ماخذ سمجھی جائے گی۔

لیکن یہ بات دھیان میں رہے کہ قرآن نے حالاتِ نبوی ﷺ کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بجائے اجمال سے کام لیا ہے چنانچہ جب وہ کسی معرکہ پر گفتگو کرتا ہے تو اس کے اسباب پر روشنی ڈالتا ہے نہ مسلمانوں اور مشرکوں کی تعداد بیان کرتا ہے نہ مقتولین و مجروحین پر بحث کرتا ہے، بلکہ وہ جنگ کے نصیحت آموز پہلوؤں کو نکھارتا اور عبرت آموز واقعات پر تبصرہ کرتا ہے۔ اور یہی معاملہ انبیاء کے قصّوں اور اقوامِ ماضیہ کے حالات کے ساتھ بھی ہے، اسی لیے ہم سیرتِ نبوی ﷺ سے متعلق قرآنی نصوص پر اکتفا نہیں کرسکتے اور ان سے حیاتِ رسول ﷺ کی مکمل تصویر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔

(۲) صحیح احادیث:

صحیح احادیث جنہیں آئمۂ حدیث نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے اور جن پر عالمِ

اسلام میں اعتماد کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں۔

صحاحِ ستہ [1]: ...... بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ۔ اسی میں مؤطا امام مالک اور مسند امام احمد کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ یہ کتابیں خاص طور سے بخاری و مسلم صحت و اعتماد اور تحقیق کی بلند چوٹی پر ہیں، رہی دوسری کتابیں تو ان میں صحیح اور حسن دونوں طرح کی احادیث ہیں بلکہ بعض میں تو ضعیف احادیث بھی ہیں۔

اِن کتابوں سے، جو نبی ﷺ کی حیاتِ مبارک، آپ ﷺ کے حالات و واقعات، جنگ و صلح اور اعمال و کردار پر مشتمل ہیں، ہم سیرتِ رسول ﷺ کی ایک جامع فکر اخذ کر سکتے ہیں گرچہ بسا اوقات وہ غیر مکمل ہوتی ہے۔ اس بات سے مزید اطمینان اور انشراح ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے متصل سندوں کا ذکر ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے رسول ﷺ کی براہِ راست صحبت پائی ہے، ان کے ذریعہ اللہ نے اپنے دین کو فتح سے ہمکنار کیا ہے، اللہ کے رسول نے اپنی نگرانی میں ان کی تربیت کی ہے چنانچہ یہ لوگ تاریخ کی مکمل ترین شخصیت، اخلاق و کردار کا پیکر، ایمانی طاقت کا ہمالہ، صدق گوئی اور خوش مقالی میں یکتا، رُوح کی بلندی اور عقل کی برتری میں منفرد تھے۔ انہوں نے صحیح متصل سند سے جو کچھ بھی رسول ﷺ کے بارے میں روایت کی ہے، ضروری ہے کہ ہم اس کو تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیں اور اس سلسلے میں ہمارے دل و دماغ میں کوئی شک و شبہ سر نہ اُبھارے۔

معاند مستشرقین اور ان کے پیروکار نام نہاد مسلمان جن کا دین و مذہب سے رشتہ کمزور ہے جو مغرب اور اس کے علماء کی فتنہ پردازیوں کا شکار ہیں، اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ معتمد و مستند کتبِ احادیث کے بارے میں تشکیک پیدا کر دیں تاکہ شریعت کو آسانی سے منہدم کیا جا سکے، سیرت کے واقعات و حالات کے اندر رخنہ اندازی کی جا سکے، لیکن اللہ

---

[1] صحاح ستہ کی اصطلاح پر بعض کبار اہلِ علم نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ انہیں صحیحین وسننِ اربعہ کہا جائے۔ (ابوعدنان)

تعالیٰ، جس نے اپنے دین کی حفاظت کا بیڑہ اٹھا لیا ہے، ایسے افراد پیدا کرتا رہتا ہے جو ان کی افترا پردازیوں کے تیروں کو کند کر دیتے ہیں، ان کی تدبیریں انہی پر جا پڑتی ہیں۔ میں نے اپنی کتاب "اَلسُّنَّۃُ وَمَکَانَتِهَا فِی التَّشْرِیْعِ الْاِسْلَامِیْ" میں احادیث کی تمحیص و تنقید میں علمائے اسلام کی کوششوں سے بحث کی ہے اور مستشرقین اور ان کے پیروکاروں کا تعاقب کیا ہے اور علمی انداز میں ان سے بحث کی ہے، مجھے اُمید ہے کہ اللہ اس کا اجر دے گا اور قیامت کے دن اسے میری نیکیوں کے صفحات میں درج کرے گا۔

(۳) دَورِ رسالت کے عربی اشعار:

بلاشبہ مشرکین مکہ نے اپنے شعراء کی زبانوں سے رسول ﷺ اور آپ کی دعوت پر بدترین حملے کیے جس سے مسلمان اپنے شعراء کی زبانی ان کی تردید کرنے پر مجبور ہوئے جیسے حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے شعرائے اسلام ہیں۔ یہ سب اشعار کتبِ ادب میں درج ہیں اور سیرت کی وہ کتابیں جو بعد میں لکھی گئی ہیں، انہوں نے بھی ان اشعار کا ایک بڑا حصہ نقل کیا ہے جن سے ہم اس ماحول کے متعلق بہتیرے حقائق اخذ کر سکتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ زندگی بسر کرتے تھے اور جس میں اسلام کی دعوت آغاز قیام میں پرورش پائی اور پھولی پھلی۔

(۴) سیرت کی کتابیں:

سیرتِ نبوی ﷺ کے واقعات وہ روایات تھے جنہیں صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے بعد والوں کو روایت کرتے تھے۔ ان میں سے بعض نے سیرت کی جزئیات وتفصیلات کے تتبّع کو مخصوص کرلیا پھر تابعین نے ان حالات کو اخذ کیا اور مختلف کتابوں میں انہیں مدوّن کر دیا۔ بعض لوگوں نے اس امر پر بھرپور توجّہ صرف کی جیسے اَبان بن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (۳۲۔۱۰۵ھ) عروہ بن زبیر بن العوام (۲۳۔۹۳ھ) اور چھوٹے تابعین میں عبداللہ بن ابوبکر انصاری (۱۳۵ھ میں وفات پائی) محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (۵۰۔۱۲۴ھ) جنہوں نے عمر

بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دور میں ان کے حکم سے احادیث کو جمع کیا، اور عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری (وفات ۱۲۹ھ) کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب السیر والمغازی لابن اسحاق:

پھر سیرت پر یہ توجہ ان کے بعد والوں کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ انہوں نے تن تنہا تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ چنانچہ سیرتِ نبوی ﷺ کے مصنّفین میں سب سے زیادہ شہرت محمد بن اسحاق بن یسار (وفات ۱۵۲ھ) کو حاصل ہوئی جن کے ثقہ ہونے پر جمہور علماء اور محدثین متفق ہیں۔ البتہ مالک اور ہشام بن عروہ بن زبیر نے ان پر جرح کی ہے اور بیشتر محقق علماء نے ان دونوں بڑے علماء کی جرح کو ان ذاتی اختلافات پر محمول کیا ہے جو ان دونوں اور ابن اسحاق کے درمیان موجود تھے۔

ابن اسحاق نے اپنی کتاب ''المغازی'' اُن احادیث و روایات سے ترتیب دی جن کو انہوں نے بنفسِ نفیس مدینہ اور مصر میں سنا تھا۔ گرچہ یہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی اور ہمارے علمی ورثہ کے ذخیرہ کے ساتھ ضائع ہوگئی لیکن کتاب کے مضامین محفوظ رہ گئے ،جنہیں ابن ہشام نے اپنی سیرت کی کتاب میں اپنے شیخ بکائی کے واسطے سے روایت کی جو ابن اسحاق کے مشہور تلامذہ میں تھے۔

سیرتِ ابن ہشام:

مصنف کا پورا نام ابو محمد عبدالملک بن ایوب حمیری ہے، بصرہ میں پرورش پائی اور اختلاف روایات کے ساتھ ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔ ابنِ ہشام نے اپنی کتاب "السیرة النبویة" ان روایات سے ترتیب دی جو ان کے شیخ بکائی نے ابن اسحاق سے بیان کی تھیں، اور جو انہوں نے خود اپنے شیوخ سے اخذ کی تھیں، جن کا ابن اسحاق نے اپنی سیرت کی کتاب میں ذکر نہیں کیا تھا اور ابن اسحاق کے نام کو لوگ بھول گئے اور ایک ایسی کتاب سیرتِ نبوی ﷺ کے مآخذ میں شامل ہوگئی جو صحیح ترین اور محفوظ ترین تھی اور اس نے

ایسی شہرت اور مقبولیت حاصل کی کہ اس کتاب کو لوگ ابن ہشام کی طرف منسوب کرنے لگے اور اس کا نام سیرتِ ابن ہشام رکھ چھوڑا اور اس کی شرح اندلس کے دو عالمانِ دین السہیلی [1] (۵۰۸۔۵۸۱ھ) اور خشنی (۵۳۵۔۶۰۴ھ) نے لکھی۔

طبقات ابنِ سعد:

پورا نام مصنف کا محمد بن سعد بن منیع زہری ہے۔ بصرہ میں ۱۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں ۲۳۰ھ میں وفات پائی۔ سیرت و مغازی کے مشہور مورخ محمد بن عمر واقدی (۱۳۰ھ۔۲۰۷ھ) کے کاتب تھے۔ ابنِ سعد نے اپنی کتاب ''الطبقات'' میں سیرتِ رسول ﷺ کے بعد صحابہ و تابعین کا ان کے طبقات، قبائل اور جگہوں کے حساب سے ذکر کیا ہے اور ان کی یہ کتاب سیرت کے اوّلین مآخذ میں شمار ہوتی ہے اور صحابہ و تابعین کے محفوظ اور سچے تذکرہ کا مرجع سمجھی جاتی ہے۔

تاریخ طبری:

ابو جعفر محمد بن جریر طبری (۲۲۴ھ۔۳۱۰ھ) امام، فقیہ اور محدّث تھے۔ فقہ میں اپنی الگ رائے رکھتے تھے جو زیادہ عام نہ ہوسکی۔ انہوں نے تاریخ پر اپنی کتاب لکھی جس میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر ہی اکتفا نہ کیا پھر اسلامی مملکتوں کی تاریخ اور اپنی وفات تک کے دور پر گفتگو کی ہے۔

طبری اپنی مرویات میں حجت اور ثقہ سمجھے جاتے ہیں لیکن بیشتر انہوں نے ضعیف یا باطل مرویات کا ذکر کیا ہے جن کے اسناد کے سلسلہ میں ان راویوں پر اکتفا کیا ہے جو اپنے

[1] امام ابوالقاسم عبدالرحمٰن السہیلی (ت۵۸۱ھ) کی شرح کا نام ''الروض الافق فی شرح السیرة النبویه لابن هشام'' ہے۔ جبکہ شیخ ابوذر مصعب بن محمد بن مسعود الخشنی (ت۶۰۴ھ) کی کتاب کا نام ہے: ''شرح وتفسیر غریب سیرة ابن اسحاق'' المعروف ''شرح السیرة النبویة لابن هشام'' للخشنی۔ (ابوعدنان)

زمانے میں معروف ومشہور تھے جیسا کہ انہوں نے ابومخنف سے مرویات لے لی ہیں حالانکہ وہ متعصب شیعہ تھا اس کے باوجود طبری نے بیشتر واقعات اس کی سند سے قبول کر لی ہیں گویا اپنی ذمہ داری سے سبکدوشی اختیار کر کے سارا بار ابومخنف پر ڈال دیا ہے۔

تالیفِ سیرت کی دنیا میں انقلاب:

پھر تالیف سیرت کی دنیا میں انقلاب آیا اور سیرت کے بعض گوشے تصنیف وتالیف کے لیے مخصوص کئے جانے لگے، جیسے اَصبہانی کی کتاب "دلائل النبوة" ترمذی کی "الشمائل المحمدية"، ابن قیم کی "زادالمعاد"، قاضی عیاض کی "الشفاء" اور قسطلانی کی "المواهب اللدنبيه" اس میدان میں زبردست انقلاب کی داعی ہیں۔آخر الذکر کی شرح آٹھ جلدوں میں زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ) کے قلم سے موجود ہے۔ [1]

پھر تو ایک سلسلہ چل پڑا اور علماء اپنے دور کے ذوق اور معیار کو سامنے رکھ کر سیرت پر کتابیں تصنیف کرنے لگے۔ ہمارے دور کی مشہور ترین کتاب شیخ محمد خضری کی "نور الیقین فی سیرت سید المرسلین ﷺ" ہے۔اس کتاب کو قبولیتِ عام حاصل ہوئی اور عالمِ اسلام کے اکثر ملکوں میں دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

[1] زادالمعاد کا مکمل اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔اسی طرح ''الشمائل المحمدية'' کا پہلے مکمل اردو ترجمہ شائع ہوا اور ابھی حال ہی میں الشیخ ابوانس محمد یحییٰ گوندلوی (مترجم صحیح سنن ترمذی وغیرہ) نے علامہ البانی کی مختصر کردہ کتاب ''مختصر الشمائل المحمديه'' کا اردو ترجمہ کر کے بھی شائع کر دیا ہے جس میں سے علامہ البانی نے تمام ضعیف احادیث نکال دی ہیں،اور یہ کتاب صحیح وحسن احادیث کا ایک بہترین گلدستہ بن گئی ہے۔ (ابوعدنان)

بعثت سے پہلے کی زندگی

الف: تاریخی واقعات

ب: عبرت و نصیحت

تاریخی واقعات

بعثت سے پہلے کی حیاتِ مبارکہ سے متعلق ثابت و صادق خبریں درجِ ذیل حقائق کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

(۱)...... آپ ﷺ عرب کے معزز ترین گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان بنو ہاشم قریش کے اشرف ترین قبیلوں میں سے تھا اور قریش سارے عرب میں سب سے زیادہ محترم، بلند مرتبہ اور اعلیٰ نسب کے حامل تھے۔ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''اللہ نے مخلوقات کی تخلیق کی اور مجھے سب سے بہتر اور معزز فریق میں شامل کیا ، پھر قبائل کا انتخاب کیا اور مجھے بہترین قبیلہ میں پیدا کیا، پھر گھروں کو چنا اور مجھے بہترین گھر میں پیدا فرمایا، میں لوگوں سے قلب اور گھرانے میں سب سے بہتر ہوں۔'' (ترمذی)

قریش میں اس معزّز نسب کی اہمیت اور بلند مرتبت کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کے حسب کے واضح و اشرف ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ پر اس جہت سے کوئی الزام نہیں لگا یا گیا۔ دوسری بہت سی غلط چیزیں آپ ﷺ کی طرف منسوب کی گئیں لیکن حسب و نسب پر کیچڑ اُچھالنے کی کسی کو جرات نہ ہوئی۔

(۲)......آپ ﷺ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ آپ ﷺ کے والد عبداللہ اس وقت

چل بسے جبکہ آپ ﷺ اپنی ماں کے پیٹ میں دو مہینے کے تھے اور چھ سال کی عمر ہوئی تو ماں آمنہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں چنانچہ بچپن ہی میں والدین کی شفقت و محبت سے محرومی برداشت کرنی پڑی، اس کے بعد دادا عبدالمطلب نے کفالت کا بیڑہ اُٹھایا پھر نبی ﷺ کی عمر کے آٹھویں بہار میں دادا بھی انتقال کر گئے۔ اس کے بعد آپ کے چچا ابو طالب نے کفالت کی یہاں تک کہ بڑے ہوئے اور جوانی کی عمر کو پہنچے۔ اسی یتیمی کی طرف قرآنِ کریم نے یوں اشارہ کیا:

﴿ أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ ﴾ (سورة الضحىٰ : ٦)

''کیا اُس نے تم کو یتیم نہ پایا پھر ٹھکانا فراہم کیا؟''

(۳)...... رسول اللہ ﷺ نے آغازِ طفولیت کے چار سال بنی سعد کے درمیان صحراء میں گزارے ۔وہاں قوت و طاقت، صحت وتندرستی، فصاحت و بلاغت، بے باکی و جرات وغیرہ صفات سے مالا مال ہوئے۔ بچپن ہی میں بہترین شہ سوار ہوگئے۔ صحرا میں آپ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھنے اور سورج کی دھوپ اور کھلی ہوا میں جسمانی و روحانی تربیت حاصل کرنے کے بہترین مواقع میسر آئے۔

(۴)......آپ ﷺ بچپن ہی سے نجابت وشرافت کی پیکر تھے۔ ہوشمندی اور بیدار مغزی چہرے سے ہویدا تھی جو ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ جب دادا بیٹھتے تو خاندان کے کسی بچے کو ان کے ساتھ بستر پر بیٹھنے کی جرات نہ ہوتی، لیکن جب رسول اللہ ﷺ آتے تو ان کے بستر پر بیٹھ جاتے اور بستر سے ان کی چادر کھینچنے کی کوشش کرتے تو عبدالمطلب لوگوں سے کہتے: ''میرے پوتے کو چھوڑ دو، اللہ کی قسم! اس کے لیے ایک شان ہوگی۔''

(۵)...... آپ ﷺ بچپن میں اہلِ مکہ کی بکریاں اجرت پر چرایا کرتے تھے۔ ثابت حدیث ہے کہ:

''ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں'' لوگوں نے پوچھا: اور آپ ﷺ نے اے اللہ

کے رسول؟

فرمایا: ''ہاں میں نے بھی۔'' ❶

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

'' اللہ نے جس کو بھی نبی بنایا اس نے بکریاں چرائی ہیں' ساتھیوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ، آپ نے بھی چرائی ہیں؟ جواب دیا: ''میں اہل مکہ کی بکریاں اُجرت پر چرایا کرتا تھا۔'' ❷

پھر جب پچیس ۲۵ سال کے ہو گئے تو خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے ساتھ تجارت کرنے لگے جس کا وہ معاوضہ دیتی تھیں۔

(٦)......آپ ﷺ اپنے ہم عصر نوجوانانِ مکہ کے لہو ولعب اور عیش وعشرت میں ملوث نہ ہوئے، آپ ﷺ کو اللہ نے ان عبث کاموں سے محفوظ رکھا۔ سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ سنّ شباب میں مکہ کے کسی گھر میں سے گانے کی آواز آئی تو وہاں پہنچنے کی آپ کو خواہش ہوئی لیکن اللہ نے آپ کو نیند میں مبتلا کر دیا تو سورج کی گرمی ہی سے آپ کی آنکھ کھل سکی۔ بت پرستی میں کبھی اپنی قوم کے ساتھ شرکت نہ کی نہ ان کے ذبیحہ کو ہاتھ لگایا، نہ شراب پی نہ جوا کھیلے نہ کبھی آپ ﷺ سے فحش بات سُنی گئی نہ بیہودہ گوئی کا آپ کے یہاں ذکر ملتا ہے۔ ❸

(٧)......آپ ﷺ میں بچپن ہی سے عقل کی پختگی، محکم قوّتِ فیصلہ اور اصابت رائے واضح اور نمایاں تھی۔ خانہ کعبہ میں حجرِ اسود کی تنصیب کا واقعہ اس کی روشن دلیل ہے۔ سیلاب کی وجہ سے کعبہ کی دیواروں میں شگاف ہو گیا تھا اس لیے اہلِ مکہ نے اسے منہدم کر کے ازسر

❶ مسنداحمد بسند جیّد۔الفتح الربانی ١٥/ ١٢٧ .

❷ صحیح بخاری: ٤/ ٣٤٩

❸ صحیح بخاری: ١/ ٣٧٧ وصحیح مسلم ١/ ١٨٤۔ نیز دیکھیے: فقہ السیرۃ للغزالی؛ ص ٨٣ .

نو تعمیر کرنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ جب یہ پروگرام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور حجرِ اسود کو رکھنے کا مرحلہ سامنے آیا تو آپس میں شدید اختلاف ہو گیا کہ حجرِ اسود کو اس کی جگہ رکھنے کا شرف کس کے حصے میں آئے گا۔ ہر قبیلہ اس شرف کو حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ جھگڑا بڑھا اور جنگ کی نوبت آ گئی، لیکن پھر اس بات پر معاہدہ ہو گیا کہ کل جو شخص باب بنو شیبہ سے صبح سویرے پہلے آئے وہی حکم دے۔ چنانچہ دوسرے دن حُسنِ اتفاق سے رسولِ اکرم ﷺ آ نکلے۔ جب لوگوں نے آپ ﷺ کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ یہ امین ہے، ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں۔ [1] چنانچہ جب آپ ﷺ کو اس جھگڑے کی خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ سارے فریق مطمئن ہو گئے۔ آپ ﷺ نے اپنی چادر پھیلا دی پھر حجرِ اسود کو اٹھا کر اس میں رکھ دیا اور ہر قبیلہ کے سردار کو حکم دیا کہ وہ چادر کے کونے کو پکڑ لیں چنانچہ جب لوگوں نے اسے اٹھا لیا اور پتھر کو اس کی جگہ پہنچا دیا تو آپ نے پتھر اٹھا کر اس کی جگہ نصب کر دیا۔ سب خوش ہو گئے اور اللہ نے آپ ﷺ کی حکمت و دانش اور عقل و بصیرت کے ذریعہ عربوں کے درمیان خوں ریزی اور جنگ و جدال کو روک دیا۔ [2]

(۸)...... آغازِ شباب ہی سے اپنی قوم میں صادق اور امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ حُسنِ معاملہ، وفائے عہد، حُسنِ سیرت، حُسنِ کردار میں مشہور تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خدیجہ بنت خویلد آپ ﷺ کو تجارت میں شریک کار بنانے اور دوسروں سے کئی گنا زیادہ اجرت دینے پر تیار ہو گئی تھیں۔ چنانچہ یہ تجارتی قافلہ بصریٰ سے جب مکہ واپس آیا تو غلام نے آپ ﷺ کی امانت داری اور اخلاص کی گواہی دی اور انہوں نے خود اس سفر سے حاصل ہونے والے کثیر منافع کو دیکھا تو جو اجرت انہوں نے طے کی تھی اس سے کئی گنا زیادہ بڑھا کر دیا۔ پھر اس نیکی و اخلاص نے ان کو شادی پر رضامند کر لیا چنانچہ آپ ﷺ نے اس پیغامِ

---

[1] البدیة والنهایة لابن کثیر ۲/ ۳۰۳، الفتح الربانی ۲۰/ ۱۹۸

[2] سیرة ابن هشام ۱/ ۱۷۸، نیز دیکھئے: رحمة للعالمین ۱/ ۴۳

نکاح کو قبول کر لیا۔ حالانکہ عمر میں پندرہ سال خدیجہ رضی اللہ عنہا سے چھوٹے تھے۔ نبوت سے پہلے آپ کے حُسنِ سلوک کی بہترین شہادت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وہ قول ہے جو انہوں نے غارِ حراء سے واپسی کے بعد بطورِ تسلّی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہے تھے۔ جب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کانپتے ہوئے گھر پہنچے تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا: نہیں، ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا۔ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ ڈھوتے ہیں، مفلسوں کو روزگار فراہم کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق پر نازل ہونے والی مصیبتوں میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ [1]

(۹)...... مکہ سے باہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار سفر کیا۔ پہلا سفر اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ جبکہ آپ بارہ سال کے بچے تھے، اور دوسرا سفر خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لیے تجارت کی غرض سے جبکہ پچیس سال کے جوان ہو چکے تھے اور یہ دونوں سفر بصریٰ تک تھے اور ان دونوں ہی سفروں میں تاجروں کی گفتگو سننے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو موقع ملا۔ جن آثار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم گزرے ان کا مشاہدہ کیا اور وہاں کے باشندوں کے عادات و اخلاق کو قریب سے دیکھا۔

(۱۰)...... بعثت سے کچھ پہلے اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ غارِ حراء میں جائیں۔ یہ ایک پہاڑی تھی جو مکہ کے مغربی شمالی حصّے میں واقع تھی۔ اس میں تقریباً ایک ماہ تنہائی اور خلوت میں رہے اور یہ رمضان کے مہینے میں ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ اللہ کی نشانیوں اور اس کی عظیم قدرت پر غور کریں۔ اور یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ وحی آ گئی اور قرآن کریم کا نزول ہوا۔ [2]

---

[1] صحيح البخاری وصحيح مسلم وسنن الترمذی وسنن النسائی۔الفتح الربانی ۲۰ / ۲۰۷ ، زادالمعاد لابن القيم وتحقيقة ۱ / ۱۹ ۔ نیز دیکھئے: فقه السيرة؛ص۸۸

[2] نیز دیکھیے: رحمة للعالمين ۱ / ٤۸ ، الرحيق المختوم؛ ص۷۵ .

عبرت و نصیحت

مندرجہ سابقہ واقعات سے قاری حسب ذیل نتائج و نصائح اخذ کر سکتے ہیں:

(۱)...... جب کی داعی یا سماجی مصلح اپنی قوم کا معزّز ترین شخص ہوتا ہے تو لوگ اس کی بات زیادہ توجّہ سے سنتے ہیں۔عوام داعیانِ دین اور مصلحین کو حقیر سمجھتے ہیں اگر وہ عام گھرانوں سے ہوں یا پست حسب ونسب کے مالک ہوں۔لیکن اگر داعی ایسا فرد ہو جس کے اعلیٰ نسب کا کوئی انکار نہ کر سکے اور نہ معاشرے میں اس کے خاندان کی بلندی کو کوئی چیلنج کر سکے تو لوگوں کو کہنے کے لیے صرف افزاء اورالزام دہی کا سہارا لینا پڑتا ہے تاکہ اس کی دعوت سے عوام کو پھیر سکیں۔یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تو اس نے ابو سفیان سے آپ ﷺ کے بارے میں پہلا سوال یہی کیا کہ: تمہارے درمیان اس کا نسب کیسا ہے؟ابو سفیان نے جو اس وقت تک اپنے شرک پر قائم تھے' جواب دیا: وہ ہم میں سب سے بلند اور پاکیزہ نسل کا حامل ہے۔چنانچہ جب ہرقل ابو سفیان سے سارے سوال کر چکا اور ان کے جوابات بھی سُن چکا تو ان سارے سولات کے رازِ نہاں سے خود ہی اس نے پردہ اٹھایا: میں نے تم سے اس کے نسب کے بارے میں سوال کیا تو تم نے کہا کہ ہم میں وہ سب سے بلند نسب کا حامل ہے۔اللہ تعالیٰ نبی کا انتخاب قوم کے معزّز لوگوں میں سے ہی کرتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام اعمال کے مقابلے میں نسب کی بلندی و برتری کا کوئی وزن نہیں دیتا لیکن اس سے اس حقیقت پر کوئی ضرب نہیں پڑتی کہ جس شخص میں نسب اور عمل دونوں کی

پاکیزگی اور بلندی موجود ہو وہ سب سے زیادہ ، بلند مرتبہ اور کامیاب ہے جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے: ''تم میں سے جو دورِ جاہلیت میں اچھے تھے وہ دورِ اسلام میں بھی بہتر ہوں گے بشرطیکہ ان میں سمجھ بوجھ ہو۔'' [1]

(۲)...... داعیِ دین جب بچپن میں یتیمی کی کلفتوں اور زندگی کی مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے تو بلند انسانی اقدار کے سلسلے میں وہ حد درجہ حساس ہو جاتا ہے۔ یتیموں، مسکینوں، محتاجوں اور ستائے ہوئے لوگوں کے تئیں اس کا دل نرم جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اور ان طبقات کے ساتھ انصاف، حُسن سلوک اور رحمت ورافت کا وہ سب سے زیادہ مظاہرہ کرتا ہے۔ ہر داعیِ دین اس بات کا محتاج ہے کہ وہ اس کے اندر بلند انسانی اقدار کا وافر ذخیرہ ہو جو کمزوروں اور محتاجوں کے دکھ درد میں شمولیت کا سبب بن سکیں۔ اور اس کی سب سے بہترین صورت یہی ہوسکتی ہے کہ وہ داعیٔ دین اپنی زندگی میں ان آلام ومصائب کو خود جھیلے جن سے یتیموں، مسکینوں، اور محتاجوں اور دوسرے کمزوروں کو سابقہ پڑتا ہے۔

(۳)...... داعی جتنا زیادہ فطری ماحول میں رہے گا اور مصنوعی اور پیچیدہ زندگی سے جتنا دور ہوگا اتنا ہی اس کا ذہن صاف اور تیز ہوگا، عقل، جسم اور نفس کی طاقت وصلاحیت اتنی ہی بڑھے گی اور فکر ونظر میں اسی قدر سلامت روی اور راستی پیدا ہوگی یہی وجہ ہے کہ اللہ نے رسالت کے لیے عربوں کا انتخاب محض اتفاق اور بخت کے نتیجے میں نہیں فرمایا بلکہ انہیں اس لیے اس کاز کے لیے منتخب کیا کیونکہ وہ دوسری ہم عصر متمدن قوموں کے مقابلے میں زیادہ فطری سادگی، صحیح فکر، مستحکم اخلاق، مصائب ومشکلات کو برداشت کرنے کی طاقت اور دعوت ورسالت کی راہ میں ہر طرح کی آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔

(۴)...... دعوت کی مرکزیت اور اس کی قیادت کا اہل وہی ہوسکتا ہے جو ہوش مند، بیدار مغز اور واقفِ حال ہو۔ جو لوگ کند ذہن ، بیوقوف اور نا واقفِ حال ہوتے ہیں، وہ

[1] صحيح البخاری : ۳٤۹۳ ، صحيح مسلم ، حديث : ۲۳۷۸ .

فکری ، اصلاحی یا روحانی قیادت کے اہل کبھی نہیں ہو سکتے۔ بلکہ پوری زندگی کا قانون یہ ہے کہ کند ذہن اور فکری اضطراب کے شکار افراد استحقاق اور اہلیت کی بنیاد پر زندگی کے کسی میدان میں بھی قیادت نہیں کر سکتے۔اور اگر بخت و اتفاق اور حالات کی سازگاری کے نتیجے میں ایسے لوگوں کو قیادت کا منصب مل بھی جائے تو بہت جلد ان کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔اور قوم ان سے گلوخلاصی کر لیتی ہے کیونکہ ان کے افعال وحرکات اور نالائقی و کند ذہنی کا پتہ دے دیتی ہیں اور ان کا فکری اضطراب اور نظری آوارگی انہیں بدنام کر دیتی ہے۔

(۵)...... داعیٔ دین اپنی معیشت کے لیے ذاتی جدّ وجہد پر انحصار کرے یا کسی شریفانہ ذریعہ معاش کو تلاش کرے جس میں ذلت و مسکنت نہ ہو نہ کسی قسم کی پستی اور بے غیرتی کا شائبہ ہو۔آج داعیانِ دین عوام کے صدقات وعطیات پر گزر بسر کرتے ہیں۔ بھلا وہ اپنی قوم میں کوئی منزلت اور تکریم کیسے پا سکتے ہیں جبکہ ملازمت اور صدقات وعطیات کا سہارا لینے کی وجہ سے وہ خود اپنی نظروں میں گر چکے ہوتے ہیں، جب ہم دعوت دارشاد کے علمبرداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ مختلف حیلوں سے عوام کی دولت سمیٹتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ خود اپنی نظروں میں حقیر و بے مایہ ہے پھر بھلا اس کی قوم اور پڑوسی کے دل میں اس کی کیا وقعت ہوگی؟ اور جو اپنے لیے ذلّت کو پسند کر لے وہ مکارمِ اخلاق کی دعوت کیسے دے سکتا ہے اور سرکشوں اور مفسدوں کے مقابلے میں کیسے ٹک سکتا ہے؟ شر وفساد کے خلاف جنگ کیسے کر سکتا ہے؟اور پوری اُمّت کے اندر کرامت وخودداری اور بلندی وبرتری کی روح کیسے جنم دے سکتا ہے؟؟!

(٦)...... داعی کی جوانی پاکیزہ ہوگی،اخلاق اعلیٰ ہوگا تو دعوت الیٰ اللہ میں اسے کامیابی ملے گی،اصلاح اخلاق کا منصوبہ تکمیل کو پہنچے گا اور منکرات وفواحش کے استیصال میں اسے تقویت حاصل ہوگی اس لیے دعوتِ دین کا کام کرنے سے پہلے اس کی جو ذاتی ونجی زندگی تھی اس پر کوئی کیچڑ نہ اچھال سکے گا۔ہم نے بہت دیکھا کہ لوگ اصلاح واخلاق کی دعوت

لے کر اٹھے، لیکن ان سے اعراض و بے نیازی کی بہت بڑی وجہ ان کا ماضی کا کردار بد بنی پچھلا ریکارڈ ان کی راہ میں روڑے اٹکاتا رہا بلکہ ماضی کی بد کرداری ان ادعیانِ دین کی صداقت میں بھی شک و شبہ کا موجب بن جاتی ہے اس طرح سے لوگ اس پر الزام لگاتے ہیں کہ دعوتِ اصلاح کے پس پردہ اس کے نجی مفادات کام کر رہے ہوں یا یہ اعتراض اٹھتا ہے کہ جب یہ شخص دنیا کی لذتوں اور شہوتوں سے اُکتا گیا اور ایسی عمر میں داخل ہو گیا جہاں مال و دولت، عزت و شہرت، جاہ و منصب کے حصول کی کوئی شکل نہ رہ گئی تو اب دعوت دین کا کام کرنے چلا ہے۔

لیکن اگر نوجوانی میں اس کا کردار بے داغ رہا ہو تو ہمیشہ سر اُٹھا کر وہ بات کرے گا، اس کی پیشانی ہمیشہ روشن رہے گی، دُشمنانِ اصلاح اس کی ماضی کی زندگی پر انگلی نہ رکھ سکیں گے اور اس کی تذلیل کا کوئی موقع نہ پائیں گے اور عوام النّاس کے سامنے اس کا مذاق نہ اُڑا سکیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ اللہ صدق و اخلاص سے توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور اس کی حال کی نیکیوں کے طفیل ماضی کی بُرائیوں کو مٹا دیتا ہے لیکن یہ دوسری چیز ہے۔ اس داعی کے معاملے سے مختلف ہے جو اپنی دعوت کی کامیابی کا منتظر ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا اخلاق درست رہا ہو اور عوام النّاس میں اس کی حیثیت اچھی جانی جاتی ہو۔

(۷)...... سفر، عوام سے رابطہ، افراد کے حالات و عادات اور ان کی مشکلات و مسائل سے آگاہی حاصل کرنے سے دعوت کی کامیابی خاصی یقینی ہو جاتی ہے۔ جو لوگ کتابوں اور تحریروں کے ذریعے عوام النّاس تک پہنچتے ہیں، براہِ راست ان کے رُجحانات کا سابقہ کرنے سے کتراتے ہیں وہ دعوتِ اصلاح میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عوام ان کی باتیں نہیں سُنتے نہ عقلیں ان کی دعوت پر لبیک کہتی ہیں، اس لیے عوام کو اس میں اپنے مسائل اور مشکلات سے بے نیازی دکھائی دیتی ہے۔ جو لوگ دیندار حلقے میں اصلاح چاہتے ہیں اُنہیں ان کے

ساتھ ان کی مسجدوں میں' ان کی مجلسوں اور سوسائٹیوں میں اٹھنا بیٹھنا پڑے گا اور جو کسانوں اور مزدوروں کی اصلاح چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بستیوں میں جائیں' ان کے کارخانوں کا دورہ کریں۔ ان کے گھروں میں کھائیں پئیں اور ان کے ساتھ ان کی محفلوں اور چوپایوں میں گفتگو کریں۔ اور جو عوام النّاس کے درمیان رائج معاملات کی درستگی چاہتا ہے، اُسے بازاروں' تجارت گاہوں' فیکٹریوں' کلبوں' میں ان کے ساتھ گھل مل کر رہنا ہوگا اور جو سیاسی ڈھانچوں کو تبدیل کرنا چاہتا ہے اسے سیاستدانوں کی صحبت اختیار کرنی ہو گی، ان کی تنظیموں سے ربط رکھنا ہوگا' ان کی تقریریں سننی ہوں گی' ان کے پروگرام اور منصوبوں کا مطالعہ کرنا ہوگا پھر اُس ماحول کو سمجھنا ہوگا جس میں وہ رہتے ہیں' اس تہذیب اور ثقافت کو نگاہ میں رکھنا ہوگا جس کے سر چشمہ سے وہ سیراب ہو رہے ہیں' اس رجحان کو پڑھنا ہوگا جس کی طرف وہ لپک رہے ہیں تا کہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہ کس طرح انہیں مخاطب کرے کہ وہ اس سے دور نہ بھاگیں' کیسے ان کی اصلاح کرے کہ وہ مخالفت اور جنگ پر آمادہ نہ ہو جائیں اور جذباتی ہو کر اس کی دشمنی پر اڑ نہ جائیں۔

اسی طرح داعیٔ دین کو تجرباتِ زندگی اور عوام النّاس کے معاملات سے واقفیت حاصل کر کے اللہ کے اس ارشاد کی منشاء پوری کرنی چاہیے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾

(سورة النحل : ١٢٥)

''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔''

اور وہ اس قول کا مصداق بن سکیں:

((حَدِّثُو النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ، أَتُحِبُّوْنَ اَنْ يُّكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ.)) [1]

---

[1] البخاری موقوفاً وَضَعَّفَهُ اَلْاَلْبَانِیْ فِیْ ضَعِیْفِ اَلْجَامِعِ الْصَغِیْر : ٢٧٠١ .

''لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کرو' کیا تم پسند کرتے ہو کہ (تمہاری نادانی سے) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کر دی جائے؟''

(۸)...... داعیٔ دین کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ اوقات ایسے فارغ کرے جس میں خلوت گزینی کر سکے' تنہائی میں اللہ سے اپنی روح جوڑ سکے' اور ارد گرد کی مضطرب زندگی اور مذموم اخلاق کی کدورتوں سے اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے۔ اس طرح کی خلوتیں آپ کو محاسبۂ نفس کی دعوت دیں گی' اگر کسی خیر میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہوگی' کسی رخ پر آپ بہہ گئے ہوں گے' حکمت کے راستے سے کنارہ کش ہو گئے ہوں گے یا کسی قسم کی غلطی کر دی ہو گی یا لوگوں سے مناظرہ اور مباحثہ میں اُلجھ گئے ہوں گے تو اپنا محاسبہ آپ کرنے کا موقع میسّر آئے گا۔ اللہ کی یاد خصوصی طور پر آپ کے دل و دماغ پر حاوی ہو سکے گی۔ جنّت وجہنّم اور قیامت کے مناظر آپ کی نگاہوں کے سامنے آ سکیں گے' موت' اس کی تلخی اور اسکی تکلیف کا احساس کر سکیں گے' اسی لیے تہجد اور قیام و للیل نبی ﷺ کے حق میں فرض تھا اور دوسروں کے حق میں مُستحب تھا۔ اس نفل کی ادائیگی کے سب سے زیادہ مستحق اور ضرورت مند ادعیانِ دین ہیں۔ اور خلوت' تہجد اور رات کی تنہائیوں میں اللہ سے ملاقات کا شرف اور اس کی لذت وہی پا سکے گا جسے اللہ اس کی توفیق دے دے۔ ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ اپنی عبادت و تہجّد کے سلسلے میں کہا کرتے تھے: ہمیں ایسی لذّت ملتی ہے کہ اگر بادشاہ اس کا پتہ پا جائیں تو اس کی وجہ سے ہمیں قتل کرا دیں۔

ہمارے لیے اللہ کا وہ ارشاد کافی ہے جس میں اس نے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝١ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝٢ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝٣ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝٤ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝٥ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝٦ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا

طَوِيلًا ۝﴾ (سورۃ المزمل : ۱ تا ۷)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر تم' آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو' ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت اس رات کا اُٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے والوں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔''

بعثت سے ہجرتِ حبشہ تک

الف: تاریخی واقعات

ب: عبرت و نصیحت

تاریخی واقعات

اس دور کے تاریخی واقعات مندرجہ ذیل حالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(ا)...... رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول ہوتا ہے۔ جب آپ ﷺ چالیس سال کے ہو جاتے ہیں تو رمضان کے مہینے میں جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آپ کے پاس آتے ہیں۔ امام بخاری اپنی کتاب ''الصحیح'' میں اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متصل سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں اور نزولِ وحی کی کیفیت بتاتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز نیند میں صالح خواب کے ذریعہ ہوا۔ آپ جو خواب دیکھتے تھے وہ سپیدئ صبح کی طرح روشن ہوتا۔ پھر خلوت آپ کو بھا گئی۔ آپ ﷺ غارِ حراء میں کئی کئی رات عبادت اور تحنّث کی غرض سے تنہائیوں میں بیٹھے رہتے، پھر خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتے اور زادِ راہ لیتے یہاں تک کہ حق آپ ﷺ کے پاس آ گیا اور اس وقت آپ ﷺ غارِ حراء میں خلوت گزیں تھے۔ آپ ﷺ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا: ﴿ اِقْرَاْ ﴾ (پڑھو) آپ ﷺ نے فرمایا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ: اس نے مجھے پکڑ لیا اور زور سے بھینچا، ایسا معلوم ہوا کہ جان نکل گئی پھر چھوڑ دیا اور کہا: ﴿ اِقْرَاْ ﴾ (پڑھو) میں نہ کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ پھر اس نے مجھے پکڑ لیا اور دوسری بار بھینچا، ایسا لگا کہ جان نکل گئی پھر چھوڑ دیا اور کہا: ''پڑھو''۔ میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا، اس نے مجھے پکڑ لیا اور تیسری بار بھینچا پھر چھوڑ دیا اور کہا:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ

الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۗ﴾

(سورۃ العلق : ۱ تا ۵)

''پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو ار تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اور انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔''

رسول اللہ ﷺ اس کے بعد گھر واپس آئے تو آپ ﷺ کا دل دھڑک رہا تھا۔ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور کہا: مجھے چادر اڑھاؤ' مجھے چادر اڑھاؤ۔ لوگوں نے آپ ﷺ کے اوپر چادر ڈال دی یہاں تک کہ خوف دور ہو گیا۔ آپ ﷺ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تمام حالات بتانے کے بعد کہا: مجھے اپنے آپ کے بارے میں خدشہ لگ رہا ہے۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''ہرگز نہیں' اللہ کی قسم! وہ آپ ﷺ کو رسوا نہیں کرے گا۔ آپ ﷺ تو صلہ رحمی کرتے ہیں' کمزوروں کے بوجھ ڈھوتے ہیں' مفلسوں کو روزگار فراہم کرتے ہیں' مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور حق پر نازل ہونے والی مصیبتوں میں اس کا ساتھ دیتے ہیں''[1]...... خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو لے کر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزیٰ کے پاس آئیں، جو آپ کے چچا زاد بھائی تھے' جاہلیت میں نصرانیت اختیار کر لی تھی اور عبرانی لکھتے تھے۔ انجیل کو عبرانی زبان میں' جتنا اللہ نے توفیق دی لکھا' بہت بزرگ ہو گئے تھے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔ چنانچہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: اے بھائی! پنے بھتیجے کی باتیں سنیئے۔ آپ ﷺ سے ورقہ نے پوچھا: بھتیجے کیا بات ہے؟ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں ساری بات بتائی تب ورقہ نے فرمایا: یہ ناموس وہی ہے جو موسیٰ پر نازل ہوا تھا۔ اے کاش کہ میں جوان ہوتا۔ کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا جب تمہاری قوم تمہیں نکال دے گی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا: کیا یہی لوگ نکال دیں گے؟ انہوں نے کہا: ہاں جس شخص نے بھی وہ

[1] بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی۔ الفتح الربانی ۲۰/ ۲۰۷، زادالمعاد۱/ ۱۹.

پیغام پیش کیا جو تمہیں دیا گیا ہے، اس کی مخالفت کی گئی ہے۔ اگر میں نے تمہارا زمانہ پایا تو میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔ پھر ورقہ جلد ہی وفات پا گئے [1] اور وحی کا سلسلہ بند ہو گیا۔'' [2]

ابنِ ہشام نے ابنِ اسحاق سے یوں روایت کی ہے کہ: ''جبرائیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حراء میں سو رہے تھے، دیباج کے ایک تھیلے کے ساتھ تھے جس میں ایک کتاب تھی۔ چنانچہ کہا: ﴿اِقْرَاْ﴾ اور اس کے بعد روایت کے بقیہ الفاظ اس طرح ہیں۔ آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اسے پڑھا۔ پھر وہ ختم ہو گیا تو جبرائیل علیہ السلام واپس چلے گئے اور میں نیند سے بیدار ہو گیا، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے دل میں ایک کتاب لکھ دی گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: میں نکلا یہاں تک کہ پہاڑی کے وسط ہی میں تھا کہ آسمان سے ایک آواز سنی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرائیل ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی کہ دیکھوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جبرائیل علیہ السلام ایک آدمی کی صورت میں موجود ہیں جس کے دونوں قدم افق آسمان میں جمے ہوئے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرائیل ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں کھڑا دیکھتا رہا نہ قدم آگے بڑھ رہے تھے نہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ میں نے ان سے اپنا چہرہ ہٹا کر آسمان کے دوسرے حصّوں کی طرف دیکھا تو ہر گوشے میں یہی سماں نظر آیا۔ میں اسی طرح کھڑا رہا۔ آگے بڑھ رہا تھا نہ پیچھے ہٹ رہا تھا کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنے قاصد کو میری طلب میں بھیجا۔'' الخ

(۲)...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا لائیں، ان کے بعد چچا زاد بھائی علی رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے جبکہ وہ دس سال کے بچے تھے۔ پھر غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

---

[1] ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ورقہ کے جنّتی ہونے کی خبر دی ہے۔ بحوالہ مسند بزار، ابن عساکر، مستدرك حاكم ۲/ ۶۰۹، فقه السيرة؛ص ۱۰۰ للتفصيل: البداية والنهاية لابن كثير ۳/ ۱۰۰۹، سيرة امام الانبياء صلی اللہ علیہ وسلم از را قيم؛ ص ۲۶۷، ۲۶۸ .

[2] صحيح بخاری ۱/ ۱، ومسلم ۱/ ۲۵ .

نے اسلام قبول کیا۔ پھر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ غلاموں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے بلال بن ابی رباح حبشی رضی اللہ عنہ ہیں۔ بالعموم سب سے پہلے ایمان حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حصّے میں آیا۔ ان کے ساتھ منگل کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا پہلا دن ہے۔ اس وقت دو رکعت صبح کو اور دو رکعت شام کو نماز پڑھتے تھے۔

(۳)...... پھر وحی ایک لمبے عرصے تک رُکی رہی۔ اس فترۂ وحی کی تعیین میں مختلف روایات آتی ہیں، طویل ترین مدت تین سال کی ہے اور سب سے کم مدت چھ مہینے کی ہے اور یہی صحیح ہے [1] وحی کا انقطاع آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت شاق گزرا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت پریشان رہنے لگے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑوں کی طرف نکل جاتے اور اپنا سر ٹکرا کر چور چور کر دینے کا ارادہ کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خدشہ تھا کہ اللہ نے رسالت کے لیے انتخاب کرنے کے بعد مبادا ٹھکرا دیا ہو۔ لیکن اس کے بعد دوبارہ وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا جیسا کہ امام بخاری نے اپنی "الصحیح" میں روایت کی ہے۔ جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: میں جا رہا تھا کہ آسمان سے ایک آواز سُنی۔ نگاہ اٹھائی تو اس فرشتے کو' جو میرے پاس حراء میں آیا تھا' آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے پایا۔ میں ڈر گیا اور واپس ہو گیا۔ میں نے گھر والوں سے کہا: مجھے چادر اڑھاؤ' تب اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَأَنذِرْ ۝٢ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝٤ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝٥﴾ (سورۃ المدثر : ۱ تا ۵)

"اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو اور اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے دور رہو۔"

---

[1] یہ عرصہ چند دنوں پر مشتمل تھا۔ (فتح الباری ۱/ ۲۷ ، ۱۲/ ۳٦۰) اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ڈھائی تین سال تھا، یہ صحیح نہیں۔ (شرح المواهب للزرقانی، الرحیق المختوم؛ ص۷۸)

پھر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور برابر وحی آتی رہی۔ ❶

(۴)......اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ مکمل تین سال تک ہر اس شخص کو اسلام کی دعوت دیتے رہے جس کی سمجھ بوجھ پر آپ ﷺ کو اعتماد ہوا یہاں تک کہ عقل کی پختگی اور فکر وقلب کی سلامتی رکھنے والے مردوں اور عورتوں کی ایک تعداد مسلمان ہوگئی۔

(۵)...... جب اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد تیس کے قریب پہنچ گئی تو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ اب علی الاعلان تبلیغ کریں فرمایا گیا:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (الحجر: ٩٤) ❷

''پس اے نبی! جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پرواہ نہ کرو۔''

(٦)...... نئے اسلام لانے والوں اور رسول اللہ ﷺ کو ستانے اور تکلیفیں دینے کا مرحلہ شروع ہوگیا۔ مشرکین اس بات سے خوف زدہ ہوگئے کہ رسول ﷺ ان کی آرزوں اور تمناؤں کو حماقت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، ان کے معبودوں کو غلط کہتے ہیں اور ایک نیا دین پیش کرتے ہیں جو ایک الہٰ واحد کی طرف بلاتا ہے جسے نگاہیں نہیں پکڑ سکتیں بلکہ وہ خود نگاہوں کو قابو میں رکھتا ہے اور وہ باخبر اور واقف حال ہے۔

(۷)......فترۂ وحی کے اس عرصے میں رسول اللہ مسلمانوں کو چپکے سے ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہ جو اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکے تھے، کے گھر میں جمع کرتے، قرآن کی جو آیات نازل ہو چکی تھیں، ان کی تعلیم دیتے اور دین وشریعت کے نازل شدہ احکام وقوانین اُنہیں سکھاتے۔

❶ صحيح بخاری، كتاب التفسير، باب ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ ٢/ ٧٣٣.

❷ اس طرح سورۃ الشعراء آیت ۲۱۴ اور سورۃ التغابن کی پہلی پانچ آیات بھی اسی مرحلے کا آغاز ہیں۔ (ابوعدنان)

(۸)...... ایسے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کوہِ صفا پر کھڑے ہو گئے اور قریش کے ایک ایک قبیلے کو نام لے کر پکارا اور انہیں اسلام قبول کرنے اور بت پرستی چھوڑ دینے کی دعوت دی، جنت کا شوق دلایا اور جہنم سے آگاہ کیا۔ ابولہب نے بگڑ کر کہا: تیرا بُرا ہو، کیا اسی لیے ہمیں جمع کیا ہے؟ [1]

(۹)...... قریش نے رسول اللہ ﷺ کو زک پہنچانا چاہا تو ان کے چچا ابو طالب نے ان کی حفاظت کی اور آپ ﷺ کو قریش کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن سرداروں کے چلے جانے کے بعد بھتیجے سے کہا کہ دعوت کی رفتار ذرا سست کر دیں۔ چناچہ اس گفتگو سے آپ ﷺ کو اندیشہ ہو کہ چچا نے بے یار ومددگار چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہ مشہور جواب دیا:

''اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں اور یہ چاہیں کہ میں اس کام سے باز آ جاؤں یہاں تک کہ اللہ اسے غالب کر دے یا اس کے مخالفین کو ہلاک کر دے تو میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' [2]

(۱۰)...... اس کے بعد رسول ﷺ اور اصحاب رسول کے اوپر مشرکین کی سختیاں بڑھ گئیں یہاں تک کہ کتنے ہی اس دردناک عذاب کو جھیلتے ہوئے شہید ہو گئے اور کتنوں کی آنکھیں ضائع ہو گئیں۔

(۱۱)...... جب قریش نے دیکھا کہ مسلمان اپنے عقیدے پر جمے ہوئے ہیں تو رسول ﷺ اللہ سے یہ گفتگو کرنی چاہی کہ جتنا مال چاہیں لے لیں یا ہمارے بادشاہ بن جائیں، لیکن مصالحت ہو جائے تو آپ ﷺ نے اس سودے بازی سے انکار کر دیا۔

---

[1] بخاری؛۸/ ۴۰۰ ، مسلم؛۱/ ۱۳٤ .

[2] ابنِ جریر ۲/ ٦۷۔طبرانی کبیر واوسط وابویعلیٰ۔مجمع الزوائد؛ ٦/ ۱۵۔ لیکن شیخ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (تخریج فقه السیرة؛ ص۱۱٤ ، ۱۱۵) (ابوعدنان)

(۱۲)...... جب اللہ کے رسول ﷺ نے دیکھا کہ قریش کے مظالم بڑھتے جا رہے ہیں اور اُن کی سختیاں نا قابلِ برداشت ہوتی جارہی ہیں تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ حبشہ چلے جاؤ وہاں کا بادشاہ کسی پر ظلم نہیں کرتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانیاں فراہم کر دے گا اور اس تنگی اور مصیبت سے نکال دے گا۔ چنانچہ پہلی بار بارہ آدمیوں نے ہجرت کی اور چار عورتوں نے۔ پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے ہیں اور اسلام کے غلبہ کا وقت آ رہا ہے تو واپس لوٹ آئے لیکن پھر جلد ہی دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی اور اس بار دوسری ہجرت میں ۸۳ مرد اور ۱۱ عورتیں تھیں۔

(۱۳)......مشرکین نے رسول اللہ ﷺ، بنو ہاشم اور بنو مطلب کا بائیکاٹ کر دیا کہ ان سے معاہدہ کیا جائے نہ ان کے اندر شادی کی جائے نہ ان سے لین دین کیا جائے اور نہ ان کی طرف سے کسی مصالحت کی پیش کش کو قبول کیا جائے۔ یہ مقاطعہ دو یا تین سال تک جاری رہا جس سے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو سخت تکلیفیں اُٹھانی پڑیں، پھر قریش کے کچھ زیرک اور دانا افراد کی کوششوں سے یہ مقاطعہ ختم ہو گیا۔ [1]

[1] صحیح بخاری؛ ۱/ ۲۱۶ باب نزول النّبی ﷺ بمکة: ۱/ ۵۴۸، باب تقاسم المشرکین علی النبی ﷺ، زادالمعاد: ۱/ ۲۹۹، طبقات ابن سعد اردو: ۱/ ۳۰۸۔

عبرت و نصیحت

(۱)...... جب اللہ کسی بندے کو خیر و اصلاح کی دعوت کے لیے منتخب کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں معاشرے کی گمراہی اور فساد سے نفرت بھر دیتا ہے۔

(۲)......محمد ﷺ نبوت کی تمنا کرتے تھے نہ اس کا خواب دیکھ سکتے تھے۔ یہ اللہ کا کرم تھا کہ اس نے آپ ﷺ کے دل میں خلوت گزینی کا منصوبہ ڈال دیا تا کہ تطہیر و تزکیہ ہو سکے اور کارِ رسالت کو سنبھالنے کے لیے روحانی تیاری ہو سکے۔ اگر آپ ﷺ نبوت کے منتظر ہوتے تو نزولِ وحی سے خوف زدہ نہ ہوتے اور خدیجہ رضی اللہ عنہا سے غارِ حراء میں رونما ہونے والے مظہر کی بابت بے چینی کا اظہار نہ کرتے اور خود آپ کو اپنے رسول ہونے کا قطعی علم اس وقت ہوا جب آپ نے جبرائیل علیہ السلام کو کہتے سُنا: اے محمد ﷺ!، تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرائیل ہوں۔ اور جب ورقہ بن نوفل نے آپ ﷺ سے اور خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ غار میں جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ وہی وحی ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتی تھی۔

(۳)......اصلاح کی دعوت جب عوام کے معتقدات اور ان کے فہم وشعور سے نامانوس ہو تو داعیٔ دین کو اس وقت تک خفیہ کام کرنا چاہیئے .... جب تک ایسی تعداد نہ فراہم ہو جائے جو ان اصولوں پر ایمان لے آئے اور ان کی راہ میں سود و زیاں سے بالاتر ہو کر ہر قسم کی قربانیاں دے۔ تا کہ داعی کی راہ روک دی جائے تو اس کے پیروکار اس علم کو اٹھالیں اور اس طرح اس دعوت کا تسلسل یقینی ہو جائے۔

(۴)......اللہ کے رسول ﷺ نے عرب کے سامنے ایسا پیغام رکھا جس سے وہ نامانوس تھے، چنانچہ اس دعوت کی زبردست مخالفت ہوئی اور آپ کا اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا کام کرنے کی پوری کوششیں کیں۔ اس سے قومیت کے علمبرداروں کے ان خیالات کی سخت تردید ہوتی ہے کہ محمد ﷺ عرب قوم کی سربلندی چاہتے تھے اور انہیں کی توقعات اور آرزؤں

کی تکمیل کر رہے تھے۔ یہ ایک مضحکہ خیز اور بے بنیاد دعویٰ ہے۔ تاریخی حقائق اس کی بھرپور تردید کرتے ہیں۔ اس طرح کی بے بنیاد باتیں وہی کہہ سکتا ہے جو قومیّت کے رنگ میں پوری طرح رنگ چکا ہو اور اسلام کو عربوں کا ذاتی مذہب اور اِن کی فکر کی پیدا وار سمجھتا ہو۔ اس سے رسول ﷺ کی نبوت کا واضح انکار اور اسلام کے خلاف بدطینتی و بدباطنی صاف جھلکتی ہے۔

(۵)...... مشرکین اور مخالفین کے بدترین مظالم اور نوع بہ نوع عذاب اور تعزیر کے باوجود اگر مسلمان اپنے عقیدے پر قائم رہیں تو یہ ان کی ایمانی صداقت اور اخلاص' بلندئ نفس اور روحانی پاکیزگی کی دلیل ہے کیونکہ وہ اس آزمائش میں اضمیر کی راحت اور نفس و عقل کا اطمینان محسوس کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی جو خوشنودی حاصل ہوتی ہے وہ ان کے جسموں کو پہنچنے والے نقصانات' مظالم اور اذیتوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ سچے اور مخلص مسلمانوں اور راست باز ادعیانِ دین کے اوپر ان کی روح کا ہمیشہ غلبہ ہوتا ہے جسم و شکم کا ان پر بالکل غلبہ نہیں ہوتا وہ روح کی ضروریات و مطالبات کی تکمیل کی فکر زیادہ کرتے ہیں اور جسم کے راحت و عشرت اور لذّت کے مطالبات پر دھیان نہیں دیتے۔ اور اسی سے دعوتیں فتح یاب ہوتی ہیں اور عوام تاریکیوں اور جہالتوں کے چنگل سے آزاد ہوتے ہیں۔

(۶)...... رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب سے جو فرمایا تھا اور قریش کی مال و دولت اور سلطنت و بادشاہت کی پیش کش کو آپ ﷺ نے جس طرح ٹھکرا دیا تھا وہ آپ ﷺ کے دعوائے رسالت کی صداقت کی دلیل ہے۔ اور عوام کی ہدایت کے سلسلے میں آپ ﷺ کی شدید خواہش کا پتہ دیتی ہے۔ اسی طرح داعئ دین کو اپنی دعوت پر جما رہنا چاہیئے، چاہے غلط کار کیسا ہی غلط پروپیگنڈہ کریں' جاہ و منصب کی کتنی ہی پیش کش کریں۔ حق کی راہ میں تھکن اور مصائب مومنین کے نزدیک ضمیر کے لیے راحت اور قلوب کے لیے تسکین کا سامان ہوتے ہیں اور اللہ کی رضا اور اس کی جنت دنیا کے تمام مناصب اور مال و منال سے زیادہ قیمتی ہے۔

(۷)...... داعئ دین کو روزانہ یا ہر ہفتہ اپنے انصار و اعوان کو مجتمع کرنا چاہیئے تاکہ دعوت پر ان کے ایمان میں اضافہ ہو اور وہ اس کے اسالیب' آداب و شرائط اور طریقہ کار سمجھ

سکیں اور اگر علی الاعلان یہ کام کرنے میں اندیشہ اور خطرہ ہو تو خفیہ طور سے اسے انجام دے تا کہ باطل پرست ان کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں اور ان سب کا کام تمام نہ کر دیں یا انہیں مزید مظالم کے شکنجوں میں نہ پھنسا دیں۔

(۸)...... داعیٔ دین اپنے اقرباء کی سب سے پہلے فکر کرے' انہیں اصلاح کی دعوت دے' اگر وہ لوگ اعراض کریں تو اللہ اور عوام کے سامنے وہ معذور ہو گا اور جس فساد اور ضلالت میں وہ مبتلا ہوں گے اس سے وہ بریٔ الذمہ ہو جائے گا۔

(۹)...... جب داعیٔ دین دیکھے کہ اس کی جماعت خطرے میں ہے یا اس کے معتقدات فتنہ کا شکار ہو رہے ہیں تو اس کی ذمہ داری ہے کہ کوئی ایسا مقام فراہم کرے جہاں وہ باطل کے علمبرداروں کے مظالم سے بچ سکیں اور یہ چیز اس قربانی اور جاں سپاری کے خلاف نہیں ہے جو داعیان دین پر فرض ہے۔ اس لیے اگر وہ قلت میں ہوں گے تو باطل پرست ان کا کام تمام کر دیں گے اور ان کی دعوت اور ان کے وجود سے گلوخلاصی کرا لیں گے۔

(۱۰)...... اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو دوبارہ ہجرتِ حبشہ کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستوں اور ملحدوں کے مقابلے میں مذہب کے علمبرداروں ...... چاہے مذہب مختلف ہو ...... سے تعلق اور دوستی زیادہ مستحکم اور مفید ہوتی ہے۔ تمام آسمانی مذاہب اپنے مآخذ اور صحیح اصولوں میں بڑے اجتماعی مقاصد میں متفق ہوتے ہیں' اس طرح ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت میں بھی اتفاق پایا جاتا ہے۔ اس سے قرابت' خون' وطن یا کسی اور محرک کے ذریعہ الحادٗ بت پرستی اور کفر سے تعلق قائم کرنے کے مقابلہ میں زیادہ بہتر یہ ہوتا ہے کہ مذہب کے ماننے والوں سے ربط قائم کیا جائے۔

(۱۱)...... باطل پرست کبھی اہلِ حق کے سامنے آسانی سے گھٹنے نہیں ٹیکتے۔ دعوتِ حق کے خلاف ان کے وسائل ختم ہوتے ہیں تو دوسرے وسائل ڈھونڈ نکالتے ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ حق کو آخری غلبہ نہ نصیب ہو جائے اور باطل کی آخری سانس بھی نہ اکھڑ جائے۔

ہجرتِ حبشہ کے بعد سے ہجرتِ مدینہ تک

الف: تاریخی واقعات

ب: عبرت و نصیحت

تاریخی واقعات

اس دور کے تاریخی واقعات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)...... بعثت کے دسویں سال رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ اپنی زندگی میں آپ ﷺ کا خوب دفاع کرتے تھے، اور ان کی زندگی جب تک باقی رہی، احترام اور خوف کی وجہ سے قریش نبی ﷺ کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ لیکن جیسے ہی چچا کا انتقال ہوا، قریش کافی جری و دلیری اور بے باک ہوگئے۔ اسی لیے آپ ﷺ کے لیے چچا کی وفات گہرے رنج وغم کا محرک بنی، نبی ﷺ نے چاہا کہ بسترِ مرگ پر ابو طالب اسلام لے آئیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا کہ مبادا ان کی قوم عار کا طعنہ نہ دے۔ [1]

(۲)...... اسی سال خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی اپنے رب سے جا ملیں۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا کفارِ قریش کی طرف سے پہنچنے والی مصیبتوں، غموں اور درد و کرب کے احساسات کو ہلکا کرنے اور آپ ﷺ کو تسلی دینے میں اہم رول ادا کرتی تھیں، جب وہ اللہ کے یہاں چلی گئیں تو یہ حادثہ آپ ﷺ کے لیے مستقل حزن و کرب کا ذریعہ بن گیا اور یہ سال جس میں چچا اور بیوی خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا، عام الحزن (درد وغم کا سال) قرار پایا۔

(۳)...... چچا اور بیوی کی وفات کے بعد جب کفّارِ قریش کی سختیاں اور مظالم بڑھ گئے تو آپ ﷺ نے طائف کا رخ کیا شاید کہ قبیلہ ثقیف میں ایسے لوگ مل جائیں جو دعوت پر کان دھریں اور اس کے حامی و ہم نوا بن جائیں۔ لیکن وہاں بدترین حالات سے دوچار

[1] صحیح بخاری؛ ۱/ ۵٤۸ باب قصة ابی طالب.

ہونا پڑا۔ انہوں نے اپنے اوباشوں اور لونڈوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا جنھوں نے آپ ﷺ پر پتھر برسائے یہاں تک کہ خون بہہ کر آپ ﷺ کے دونوں مبارک قدموں پر جم گیا۔ آپ ﷺ نے طائف کے ایک باغ کا سہارا لیا اور وہاں نہایت درد و کرب سے اللہ رب العزت سے یہ دعا مانگی:

((اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ يَااَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَاَنْتَ رَبِّيْ اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ اِلٰى بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ؟ اَوْ اِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهٗ اَمْرِيْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ بِكَ غَضَبٌ عَلَيَّ فَلَا اُبَالِيْ وَلٰكِنَّ عَافِيَتَكَ هِيَ اَوْسَعُ لِيْ اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ بِهِ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ مِنْ اَنْ تُنْزِلَ بِيْ غَضَبَكَ اَوْ تُحِلَّ عَلَيَّ سَخْطَكَ لَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ.))

''الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی، اور لوگوں میں تحقیر کی بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ درماندہ اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے سپرد کر دیا ہے؟ کیا بے گانہ ترش رو کے یا اس دشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے! اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی پرواہ نہیں لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و دین کے کام اس سے ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے یا تیری نا رضا مندی مجھ پر نازل ہو مجھے تیری رضا مندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔''[1]

---

[1] معجم طبرانی کبیر؛ ۱۸۱۔ وأثنیٰ علیه ابن القیم.

(۴)...... اللہ کے رسول ﷺ طائف سے لوٹ آئے لیکن قبیلہ ثقیف نے آپ کی بات سن کر نہ دی البتہ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کے غلام عدّاس نے اسلام قبول کر لیا۔اُن دونوں بھائیوں نے جب آپ ﷺ کی یہ حالت دیکھی تو ان کا دل کچھ نرم پڑا اور ان کی انسانیت کی رگ میں کچھ جنبش پیدا ہوئی۔اُن دونوں نے اپنے نصرانی غلام عدّاس کو بلایا اور اس سے کہا کہ لو یہ انگور کا خوشہ ایک طباق میں رکھ کر اس شخص کے پاس لے جاؤ اور کہو کہ یہ ان کے کھانے کے لیے ہے۔عدّاس نے اس پر عمل کیا۔اور رسول اللہ ﷺ کی گفتگو سُن کر اور آپ ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

(۵)......معراج کا واقعہ پیش آیا۔اس کے وقوع کی تاریخ کے سلسلے میں اختلاف ہے لیکن یہ قطعی ہے کہ بعثت کے دسویں سال ہجرت سے پہلے واقع ہوئی۔صحیح روایت جس پر جمہور علماء کا اتفاق یہ ہے کہ لیلتہ الاسراء کا معجزہ اور معراج دونوں ایک ہی رات میں جسم اور رُوح کی بیداری کے ساتھ واقع ہوئے۔اللہ نے آپ ﷺ کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سیر کرائی اور پھر آسمان پر لے گیا۔پھر اسی رات مکہ میں اپنے گھر واپس آ گئے اور قریش کو اس معجزہ کی خبر دی تو وہ ہنس پڑے اور مذاق اڑانے لگے۔اور ابو بکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے قوی الایمان مسلمانوں نے فوراً اس واقعہ کی تصدیق کی۔

(۶)......اسی رات کو ہر عاقل و بالغ پر پنج وقتہ نمازیں فرض ہوئیں۔

(۷)...... رسول اللہ ﷺ نے حج کے موسم میں معمول کے مطابق قبائلِ عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنی شروع کی اور ان سے حمایت و نصرت کے خواستگار ہوئے۔آپ ﷺ نے انہیں اسلام اختیار کرنے اور بت پرستی چھوڑ دینے کی دعوت دی۔

جمرۂ عقبہ کے پاس اوس و خزرج کے ایک قبیلہ سے ملاقات ہوئی ۔انہیں اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئے۔وہ تعداد میں سات تھے۔پھر وہ مدینہ واپس ہوئے اور اپنی قوم سے نبی ﷺ سے ملاقات کا ذکر کیا اور انہیں بتایا کہ وہ اسلام قبول کر چکے ہیں اور وہ بھی

اسلام قبول کریں کہ اس میں دین اور دنیا کی بھلائی ہے۔

(۸)...... دوسرے سال حج کے موقع پر انصار کے بارہ آدمی آپ ﷺ سے عقبہ اولیٰ میں ملے اور آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ جب انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو ان کے ساتھ معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو کر دیا اور ان کو ہدایت کی کہ وہ ان کو قرآنِ مجید پڑھائیں، اسلام کی تعلیم دیں اور دین کے مسائل سے باخبر کریں۔ چنانچہ مدینہ میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلا۔

(۹)...... اگلے سال انصار کی ایک جماعت حج کے موسم میں مکہ آئی اور رسول اللہ ﷺ سے عقبہ میں بیعت کا وعدہ کیا، ان کی تعداد تہتر تھی جن میں دو عورتیں شامل تھیں۔ انہوں نے نبی ﷺ سے بیعت کی کہ آپ ﷺ کے ساتھ حفاظت و خیال کا وہی معاملہ کریں گے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ کرتے ہیں۔ پھر رسول اللہ نے ان میں سے بارہ آدمیوں اور سرداروں کا انتخاب کیا نو خزرج کے اور تین اوس کے۔

عبرت و نصیحت

(۱)...... کبھی کبھی کسی داعیٔ دین کی حمایت و حفاظت اس کے خاندان کا ایسا فرد بھی کرنے لگتا ہے جو اس کی دعوت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اور دعوت جب کمزور اور بے سہارا ہو تو یہ چیز کافی اہم ہو جاتی ہے کیونکہ اس شخص کی زندگی میں اشرار اور دشمن گزند نہیں پہنچا سکتے۔ قبیلہ اور خاندان کی عصبیت سے داعی اپنی دعوت کی حمایت و حفاظت کی خاطر فائدہ اُٹھا سکتا ہے بشرطیکہ اس کے مضر پہلوؤں سے اپنا دامن بچائے رہے۔

(۲)...... نیک اور صالح بیوی شوہر کے مسائل اور پریشانیوں میں ہاتھ بٹا کر اس کی سختیوں کو کم کر دیتی اور مصائب و مشکلات کو اس کی مطیع و منقاد بنا دیتی ہے۔ اور اس سے ذہنی اُلجھن کافور ہو جاتی ہے، دل میں ثبات و استحکام پیدا ہوتا ہے اور دعوت کی کامیابی اور اس کے اثرات کی اشاعت میں یہ چیز کافی ممدود و معاون ثابت ہوتی ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی مثال اس پاکباز اور مومن خاتون کی بہترین مثال ہے جس نے اپنے شوہر کا شانہ بشانہ ساتھ دیا اور دعوتِ دین کی کامیابی میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اور اس طرح کی معاون اور پاکباز بیوی کی وفات سے جو عظیم خسارہ ہوتا ہے اس پر داعی شوہر سوائے افسوس اور رنج و غم کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔

(۳)...... غیر مسلم شخص، جو دعوت کا حامی و مددگار ہو اور نیک و مخلص بیوی کی وفات پر

رنج وغم کرنا دعوت کے لیے اخلاص کے مزاج کا تقاضا ہے اور قربانی و تائید وحمایت میں مثالی بیوی کی وفا داری کا لازمہ ہے۔اسی لیے جب ابو طالب کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے اور آپ کو معاف کر دے میں برابر آپ کی مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا تا کہ اللہ مجھے روک دے۔''

چنانچہ مسلمان اپنے رسول کی اقتداء میں اپنے مشرک مُردوں کے لیے استغفار کرنے لگے' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے روک دیا:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾﴾

(سورة التوبة : ١١٣)

''نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں' زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دُعا کریں' چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں' جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنّم کے مستحق ہیں۔''

اس کے بعد نبی ﷺ ابو طالب کے لیے مغفرت کی دعا کرنے سے باز آ گئے اور عام مسلمان بھی اس حرکت سے رک گئے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی انہی قربانیوں کی وجہ سے نبیٔ اکرم ﷺ اپنی پوری زندگی ان کے فضل و احسان کا ذکر کرتے رہے' اچھے الفاظ میں انہیں یاد کرتے رہے اور ان کی سہیلیوں سے حُسنِ سلوک کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ سے ان کی تعریف سُن سُن کر رشک کرنے لگیں۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''میں نے ازواجِ مطہّرات میں سے کسی پر اتنا رشک نہیں کیا جتنا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر کیا۔ میں نے انہیں دیکھا نہیں، لیکن نبی ﷺ کثرت سے ان کا ذکر کرتے تھے۔ بسا اوقات بکری ذبح

کرتے پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے اور انہیں خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں میں بٹوا دیتے۔ میں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ بیٹھتی: ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سوا کوئی عورت ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر نہیں آتی! آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: ان کی یہ اور یہ خوبیاں تھیں اور ان سے میری اولاد تھی۔ [1]

(۴)...... مکہ کی بے نیازی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طائف کو رخ کرنا اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کے قیام و فروغ کے لیے کتنا پریشان تھے اور عوام کی عدمِ قبولیت سے ذرّہ برابر مایوس نہ ہوئے۔ اور پہلے میدانوں میں رُکاوٹوں کا سامنا کرنے کے بعد دوسرے میدان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اِسی طرح ثقیف کے سرداروں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لونڈوں اور بدمعاشوں کا لگا دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہر دور میں شر کا مزاج یکساں رہا ہے یعنی یہ کہ داعیانِ دین کو ایذا پہنچانے کے لیے بدمعاشوں اور لونڈوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں سے خون کا بہنا داعیانِ دین کی قوتِ برداشت اور ظلم و جبر سے مقابلہ آرائی کی ناگزیریّت پر دلالت کرتا ہے۔ باغ میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دُعا مانگی تھی اس سے آپ کے عزم و جزم، راست روی و پاکبازی، مشکلات و مصائب کے مقابلے میں صبر و ثبات کا پتہ چلتا ہے اور یہ کہ آپ کو بس رضائے الٰہی کی فکر تھی، لیڈروں اور سرداروں کی خوشنودی کی فکر قطعی نہ تھی نہ عوام کالانعام کی مرضی اور رجحان کی فکر تھی۔ اسی طرح سے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ داعیانِ دین پر جب سخت وقت آئے تو انہیں اللہ ہی کا دامن تھامنا چاہیئے اور داعی کو بس اللہ کی ناراضگی اور صرف اس کے غضب سے ہی ڈرنا چاہیئے، کسی دوسرے خوف اور ڈر سے اسے بے نیاز

[1] بخاری مع الفتح؛ ۷/ ۱۳۳، مسلم؛ ۸/ ۱۵/ ۲۲۰، ترمذی مع التحفہ؛ ۱۰/ ۳۸۶، الفتح الربانی؛ ۲۰/ ۲۴۰

ہونا چاہیئے۔

(۵)...... لیلۃ الاسراء اور معراج میں بے شمار اسرار پنہاں ہیں۔ہم ان میں سے صرف تین اسرار کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف:...... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجدِ اقصی اور فلسطین کے مسئلہ کا ربط عالمِ اسلامی کے مسئلہ سے ہے کیونکہ مکہ بعثتِ رسول کے بعد عالم اسلام کا مرکز اور اس کے اہداف ومقاصد کی وحدت کا رمز بن چکا تھا اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فلسطین کا دفاع خود اسلام کا دفاع ہے ۔زمین کے ہر گوشے کے مسلمان پر اس کی حفاظت وحمایت فرض ہے اور اس کے دفاع اور آزادی کے سلسلہ میں کوتاہی کرنا خود اسلام کے سلسلے میں کوتاہی کرنا اور ایک ایسے جرم کا ارتکاب کرنا ہے جس کی سزا اللہ ہر مسلمان کو دے گا۔

ب:...... اس سے مسلمان کی بلندی و برتری کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے اُسے دنیا کی شہوتوں اور اس کی لذّتوں سے بلند ہونا چاہیئے اور بلندیٔ رتبہ' مقصد کی پاکیزگی اور بلند اقدار کے ماحول میں رہنے اور اس کی معاشرت اختیار کرنے کے لحاظ سے اسے پوری انسانیت سے منفرد اور ممتاز ہونا چاہیئے۔

ج:...... اس سے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کی فضاؤں کی تسخیر اور ارضی کشش کے دائرے سے باہر نکلنا ممکن ہے۔ ہمارے پیارے رسول ﷺ لیلۃ الاسراء اور معراج میں فضا کی سیر کرنے والے عالمی تاریخ کے پہلے فرد ہیں اور پوری سلامتی اور حفاظت کے ساتھ زمین پر واپس بھی آ گئے ۔اگر اللہ کے رسول کے لیے معجزہ کے ذریعہ یہ ممکن ہوسکتا ہے تو عوام کے لیے اس دور میں علم وفکر کے راستے سے اسے سر کرنا ممکن ہے۔

(٦)...... لیلۃ الاسراء اور معراج میں نماز کی فرضیت اس حکمت کی طرف اشارہ کرتی

ہے جس کی خاطر نماز شروع کی گئی۔ گویا اللہ اپنے مومن بندوں سے کہہ رہا تھا: اگر تمہارے رسول کا اپنے جسم و رُوح کے ساتھ معراج کا سفر کرنا معجزہ ہے تو تمہیں بھی روزانہ پانچ بار معراج کرنی چاہیئے جس میں تمہارے جسم اور روح میرے پاس پہنچ جائیں۔ تمہارے اندر روحانی عروج ہونا چاہیئے جس سے تم شہوتوں اور لذّتوں سے اُوپر اٹھ سکو اور اس کے ذریعہ زمین کی سیادت، قہر و جبر، غلبہ و تحکّم کے ذریعے نہیں بلکہ خیر اور پاکیزگی، بلندی و اولوالعزمی اور نماز و عبادت کے ذریعے حاصل کر سکو۔

(۷)...... نبیِ اکرم ﷺ کا موسمِ حج کو عبادت کے لیے استعمال کرنا اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ داعیِ دین کو بس مجلسوں اور اپنے ماحول ہی میں دعوت دینے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اسے ہر اس مقام تک پہنچنا چاہیئے جہاں لوگ اکھٹے ہوتے ہیں اور جہاں ان کے جمع ہونے کا امکان ہو اور یہ کہ اسے لوگوں کے پیہم اعراض اور بے نیازی سے بھی مایوس نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ ایسی جگہ سے انصار و اعوان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ اور بسا اوقات اس قلیل تعداد کے ایمان لانے سے دعوتِ حق کو بڑی تقویت مل جاتی ہے اور اسی کے ذریعے شرک و کفر کا خاتمہ ہوتا ہے۔ پہلے سات انصار کا رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرنا اور آپ ﷺ پر ایمان لانا، مدینہ میں اسلام کی اشاعت اور غلغلہ کا سبب بننا اور اس کا اسلام کے غلبہ و فتح میں بڑا اہم اور بنیادی رول ہے۔

مکہ کے مظلوم اور مجبور مسلمانوں کو پھر ایک ہجرت گاہ نصیب ہو گئی جہاں وہ جمع ہو سکیں اور اللہ کے رسول ﷺ کو ایک محفوظ و مامون قیام گاہ مل گئی جہاں آپ اسلامی سلطنت قائم کر سکیں اور جہاں سے دعوت اسلامی کا کام کر سکیں اور اصحابِ رسول ﷺ شرک و کفر کا ان جنگوں اور معرکوں سے توڑ سکیں جن میں آخری انجام ایمان ہی کے لیے ہوتا تھا۔ اور شرک کو رُسوا کن شکست اُٹھانی پڑتی تھی۔ اللہ تعالیٰ اوس و خزرج کے انصار سے راضی ہو۔ اسلام

مسلمانوں اور پورے عالم پر ان کا کتنا بڑا احسان ہے! اور ان کے مہاجر بھائیوں کو اللہ تعالیٰ بلند درجات عطا کرے جو ایمان میں ان سے گے بڑھ گئے' اس کی راہ میں جان و مال اور ملک و وطن کی قربانیاں دیں اور ہم مسلمانوں کو جنتِ رضوان میں ان سب سے ملائے۔ آمین

ہجرت سے مدینہ میں قیامِ نبوی ﷺ تک

الف: تاریخی واقعات

ب: عبرت و نصیحت

تاریخی واقعات

(۱)...... قریش کو اہلِ یثرب کے ایک فریق کے اسلام لانے کا علم ہوا تو مکہ میں مسلمانوں پر ان کا ظلم و ستم اور بڑھ گیا۔ تب اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ تمام مسلمان چُھپ چُھپا کر مدینہ ہجرت کر گئے ،البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشرکینِ قریش میں اپنی ہجرت کا یہ کہہ کر اعلان کر دیا کہ: ''جس کی یہ خواہش ہو کہ اس کی ماں اسے کھو دے، اس کے بچے یتیم اور بیوی بیوہ ہو، وہ تو کل اس وادی میں مجھ سے ملے۔ چنانچہ کسی کو نکلنے کی ہمت نہ ہوئی۔

(۲)...... جب قریش کو یقین ہو گیا کہ مسلمان مدینہ میں عزّت و قوت کی زندگی پا گئے ہیں تو رسول اللہ ﷺ کا کام (نعوذ باللہ) تمام کرنے کے لیے انہوں نے منصوبہ بندی کی غرض سے دار الندوۃ میں ایک کانفرنس بلائی اور آخر متفقہ طور پر یہ بات طے پائی کہ ہر قبیلے سے ایک با ہمت اور عالی نسب نوجوان کا انتخاب کیا جائے اور وہ سب مل کر یکبارگی آپ ﷺ پر حملہ آور ہوں۔ اس طرح یہ خون سارے قبائل میں تقسیم ہو جائے گا اور کسی ایک پر اس کی ذمّہ داری نہ ہو گی۔ اور بنی عبد مناف ساری قوم سے جنگ کا خطرہ مول نہ لیں گے۔ اس کے بعد لوگ منتشر ہو گئے اور پھر ہجرت کی رات تمام منتخب نوجوان آپ ﷺ کے دروازے پر جمع ہو گئے کہ آپ نکلیں تو تلواروں سے گردن اُڑا دی جائے۔ [1]

(۳)...... اس رات اللہ کے رسول اپنے بستر پر نہ سوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ

---

[1] اشھر مشاھیر الاسلام از رفیق العظم.

آپ ﷺ کی چادر اوڑھ کر آپ کے بستر پر سو جائیں [1] اور جب صبح ہو تو کفار قریش کی ساری امانتیں ان کے حوالے کر دیں۔ پھر آپ ﷺ گھر سے نکلے اور حملہ کے لیے تیار کھڑی پارٹی آپ کو دیکھ نہ سکی۔ آپ ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر آئے۔ وہ پہلے ہی سے اپنے لیے اور رسول اللہ ﷺ کے لیے دو سواریاں تیار کر چکے تھے چنانچہ دونوں نے نکلنے کا عزم کیا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن اُریقط کو بطورِ رہبر (گائیڈ) کے معاوضے پر طے کر لیا۔ تا کہ معروف راستہ کو چھوڑ کر کوئی ایسا راستہ اختیار کرے جس تک کفار قریش کی پہنچ نہ ہو۔

(۴)...... نبیٔ اکرم ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنی پیدائش کے ۵۳ ویں سال پہلی ربیع الاول کو جمعرات کے دن نکلے۔ اس ہجرت کی خبر حضرت علی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کے خاندان کے سوا کسی کو نہ تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اسماء بنتِ ابو بکر رضی اللہ عنہما نے ان دونوں حضرات کے لیے زادراہ تیار کیا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنی نطاق (ازار بند) کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر تھیلے کے منہ کو باندھ دیا، اسی لیے آپ کو ''ذات النطاقین'' کہا جاتا ہے۔ دونوں اپنے رہبر کے ساتھ یمن کے راستے سے نکلے یہاں تک کہ غارِ ثور تک پہنچ گئے اور اس میں تین رات تک چھپتے رہے۔ ان کے پاس عبداللہ بن ابو بکر رضی اللہ عنہما رات گزارتے جو ایک دانش مند، تیز، ذہین اور سمجھدار نوجوان تھے۔ پھر سحر کے وقت وہاں سے نکل کھڑے ہوتے اور صبح قریش مکہ کے ساتھ کرتے تا کہ لوگ سمجھیں کہ یہیں سوئے تھے۔ قریش جو کوئی سازش یا منصوبہ تیار کرتے آپ اسے ذہن میں محفوظ رکھ لیتے اور شام کو نبیٔ اکرم ﷺ تک اسے پہنچا دیتے۔

(۵)...... اللہ کے رسول ﷺ بچ نکلے تو قریش کے درمیان قیامت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مکہ کے عام راستوں پر آپ ﷺ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے لیکن کوئی سُراغ نہ ملا۔ پھر یمن کے راستے کا رُخ کیا اور غار ثور کے دہانے تک پہنچ گئے۔ کسی نے کہا: شاید اس غار

---

[1] الفتح الربانی؛ ۲۰/ ۲۷۹، سیرت ابن هشام؛ ۲/ ۹۱

میں موجود ہوں۔ دوسروں نے جواب دیا: دیکھتے نہیں کہ غار کے دہانے پر مکڑی نے جال بُن رکھا ہے' پرندوں نے انڈا دے دیا ہے۔ [1] اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس غار میں کوئی داخل نہیں ہوا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کے قدموں کو دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ لوگ غار کے دہانے پر کھڑے تھے۔ آپ ﷺ کو رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ خطرے میں نظر آئی، بے چینی سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! اگر ان میں سے کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ آپ ﷺ نے یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ:

((مَا ظَنُّكَ بِاِثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا .)) [2]

''اُن دونوں کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے۔''

(۶)...... قریش نے اعلان کرا دیا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دے' گرفتار کر دے یا ان کی اطلاع لے آئے اسے سو (۱۰۰) اونٹنیاں انعام میں دی جائیں گی۔ اس کے لیے سراقہ بن مالک بن جُعشم تیار ہو گیا اور سو (۱۰۰) اونٹنیوں کے شوق میں ان دونوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

(۷)...... جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی کی تلاش بند ہوئی تو اپنے رہبر (گائیڈ) کے ساتھ غار سے نکلے اور ساحل کا راستہ اختیار کیا اور ایک لمبی مسافت طے کر لی جس کے بعد سراقہ نے انہیں جا لیا۔ جب وہ قریب ہو گیا تو اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے اور چلنے پر قادر نہ رہا۔ تین بار اس نے کوشش کی کہ اُسے رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھنے پر آمادہ کرے، لیکن وہ اَڑا رہا۔ سراقہ نے جب یہ دیکھا تو اسے یقین ہو گیا

---

[1] علّامہ البانی نے کبوتروں کے انڈوں والی روایت کو امام عقیلی، ابن معین، نسائی اور ابن حجر کے حوالے سے ضعیف قرار دیا ہے۔ (البدایه والنهایه ۳/ ۱۸۸ ، فتح الباری ۷/ ۱۸ فقه السیرة مع تعلیق الالبانی؛ص ۱۷۳)

[2] بخاری ومسلم ، ابنِ کثیر ، تسیر سورة التوبه آیت: ۴۰ .

کہ اس کا سامنا ایک سچے رسول ﷺ سے ہے۔اس نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ایک تحریر مجھے دے دیں جو ہمارے اور آپ کے درمیان ایک نشانی اور یادگار کے طور پر محفوظ رہے۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ نے ہڈّی یا جھلّی پر ایک تحریر لکھ کر اس کے حوالے کی۔آپ ﷺ نے سراقہ سے ارشاد فرمایا: سراقہ ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب کسریٰ کے کنگن تم اپنے ہاتھوں میں پہنو گے؟ پھر سراقہ مکہ لوٹ آیا اور یوں ظاہر کیا کہ اسے کسی کا پتہ نہیں چلا۔ [1]

(۸)...... اللہ کے رسول ﷺ اور یارِ غار ۱۲ ربیع الاول کو مدینہ پہنچے۔انصار آپ ﷺ کا شدت سے انتظار کر رہے تھے وہ ہر صبح مدینہ کی پہاڑیوں پر چڑھ جاتے اور اس وقت تک وہاں سے نہ ہٹتے جب تک کہ دھوپ بہت تیز اور نا قابلِ برداشت نہ ہو جاتی ۔جب انہوں نے آپ ﷺ کو دیکھا تو خوشی اور مسرّت سے بے قابو ہو گئے اور بچّیاں سرور وخوشی کے عالم میں یہ اشعار پڑھنے لگیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوِدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ
اَيُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِيْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ

''پہاڑی کے اس موڑ سے جہاں سے قافلے رخصت کیئے جاتے ہیں' آج چودھویں کا چاند نکل آیا ہے! جب تک کوئی دنیا میں اللہ کا نام لیوا رہے گا' ہم پر شکر ادا کرنا واجب ہے۔ اے وہ ذاتِ پاک جس کو ہمارے درمیان بھیجا گیا ہے، آپ ﷺ واجب الاطاعت حکم لے کر آئے ہیں''۔

(۹)...... رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے راستے میں واقع مقام ''قباء'' میں چار روز قیام

---

[1] بخاری مع الفتح؛ ۷/ ۳۳٦ ، مسلم؛۲۳٦و۲۳۷ ، مستدرك حاكم؛۳/ ۹۰۷۔ مسند احمد؛ ۳/ ۲۱۲ .

فرمایا اور وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی جمعہ کے روز آپ ﷺ وہاں سے آگے روانہ ہوئے' جمعہ بن سالم بن عوف کی برادری میں پڑھا' چنانچہ جمعہ کی نماز آپ ﷺ نے ان ہی کی مسجد میں ادا کی' جمعہ کی یہ پہلی نماز تھی اور پہلا خطبہ تھا جو آپ نے مدینہ میں دیا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ آپ ﷺ کی اونٹنی جہاں بیٹھ گئی، اسے مسجد کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ جگہ بنی نجار کے دو یتیم لڑکوں کی ملکیت تھی، آپ نے ان سے قیمت کی بابت بھاؤ تاؤ کیا تو ان دونوں نے جواب دیا: ہم اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ کو ہدیہ کر رہے ہیں، لیکن آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مال سے دس دینار سونا اس کی قیمت چکا دی۔ پھر مسلمانوں کو مل جل کر ایک مسجد بنانے کی دعوت دی اور سب اس نیک کام میں دل و جان سے لگ گئے۔ آپ ﷺ خود ان کے ساتھ اینٹیں ڈھوتے تھے یہاں تک کہ مسجد کی تکمیل ہو گئی۔اس کی دیواریں اینٹ کی تھیں اور چھت کھجور کی شاخوں اور پتیوں کی تھی۔

(۱۰)...... پھر آپ ﷺ نے مہاجرین و انصار میں غم خواری اور ہمدردی کی بنیاد پر بھائی چارہ اور مؤاخات کا ایک معاہدہ بھی کر دیا۔ انصاری اپنے مہاجر بھائی کو اپنے گھر لے جاتا تھا، اور اس کے سامنے اپنے گھر کا سارا ساز و سامان لا کر رکھ دیتا تھا کہ آؤ نصف نصف تقسیم کر لیں۔

(۱۱)...... اس موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار کے لیے ایک تحریر تیار فرمائی جس میں یہود سے امن و امان کا معاہدہ تھا اور ان کے اپنے دین و مذہب پر رہنے اور مال و جائداد کی حفاظت و بقا کا ذمّہ لیا گیا تھا اور ان کے حقوق اور ذمّہ داریوں دونوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ابنِ ہشام نے اپنی سیرت کی کتاب میں تفصیل سے اس معاہدے کا ذکر کیا ہے۔ یہ معاہدہ ایسے اصولوں پر مشتمل تھا جن پر اسلام کی پہلی مملکت قائم ہوئی تھی۔ اس میں انسانیت، عدلِ اجتماعی، دینی رواداری، معاشرے کے مُشترکہ مفادات میں باہم دگر تعاون کے نشانات واضح طور پر ہر اس شخص کے لیے ملتے ہیں جو اس پر غور کرے اور اسے

سمجھنے کی کوشش کرے۔

ہم یہاں ان عام اصولوں کا ذکر کریں گے جن پر یہ تاریخی دستاویز مشتمل ہے:

۱: بغیر کسی تفریق کے مسلم اُمت کی وحدت۔

۲: اُمّتِ مسلمہ کے افراد حقوق اور فرائض میں مساوی ہیں۔

۳: یہ اُمّت ظلم وعدوان کے مقابلے میں سینہ سپر ہوگی۔

۴: اُمّت اپنے دشمنوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں پیش پیش ہوگی۔

۵: پورا معاشرہ بہترین اور پائیدار اصولوں پر مبنی ہوگا۔

۶: حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والوں سے جنگ کی جائے گی اور ان کی مدد نہ کرنا سب کے لیے ضروری ہوگا۔

۷: جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ صلح جو بن کر اور تعاون و اشتراک کے جذبے سے رہنا چاہیں ان کی حفاظت کی جائے گی اور ان پر ہونے والے مظالم کا توڑ اور ان کا دفاع کیا جائے گا۔

۸: غیر مسلمین اپنے دین پر قائم رہنا چاہیں تو رہیں گے ،ان کے اموال محفوظ رہیں گے ،انہیں مسلمان کا دین قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا نہ ان سے ان کی دولت چھینی جا ئے گی۔

۹: غیر مسلم افراد پر واجب ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرح مملکت کے سرکاری مصارف واخراجات میں تعاون کریں۔

۱۰: غیر مسلمین کے لیے ضروری ہوگا کہ ہر جابر و باغی کے خلاف مملکت کی حفاظت میں مسلمانوں کے ساتھ تعاون کریں۔

۱۱: جب تک جنگ ہوتی رہے، جنگ کے مصارف میں ان کا اشتراک واجب ہوگا۔

۱۲: مملکت کی ذمّہ داری ہوگی کہ جس طرح مسلمان مظلومین کی مدد کرتی ہے اسی طرح

غیر مسلم مظلومین کی بھی مدد کرے۔

۱۳: مسلمانوں اور غیر مسلوں پر واجب ہوگا کہ دشمنانِ مملکت کے خلاف جنگ کریں اور جو لوگ دشمنوں کی مدد کریں ان کے خلاف بھی سینہ سپر ہوں۔

۱۴: اُمّت کا مفاد جب صلح میں ہو تو اس کے تمام مسلم وغیر مسلم فرزندوں پر واجب ہوگا کہ وہ صلح کو قبول کر لیں۔

۱۵: کسی انسان کی گرفت دوسرے انسان کے جرم کی پاداش میں نہیں ہوگی اور ہر مجرم جو جرم کرے گا اس کا وبال اس پر اور اس کے اہل وعیال پر ہوگا۔

۱۶: ملک کے اندر اور باہر جانا مملکت کی حفاظت کے لیے شرط ہے۔

۱۷: کسی گناہ گار، مجرم یا ظالم کی حمایت نہ ہوگی۔

۱۸: معاشرہ کی بنیاد نیکی وتقویٰ میں باہم تعاون پر ہوگی، ظلم وعدوان میں تعاون حرام ہوگا۔

۱۹: ان اصولوں کی حفاظت دو قوتوں کے ذریعے ہوگی:

معنوی قوت یعنی قوم کا اللہ پر ایمان لانا، اس کا خوف رکھنا اور ہر نیک ومتقی شخص کے لیے احکامِ الٰہی کی حفاظت۔

مادی قوت یعنی صدرِ مملکت جس کی نمائندگی حضرت محمد ﷺ کر رہے ہیں۔ [1]

[1] البدایہ والنہایہ؛۳/ ۲۲٤، سیرتِ ابن ہشام:۲/ ۱۰٦، مجموعة الوثائق، محمد حمید اللّٰہ پیرس؛ص٤١ تا٤٧، الاسلام وحرکة التاریخ، انور الجندی؛ص۳۳، ۳٤.

عبرت و نصیحت

(۱)...... ایک مسلمان خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہو گا تو چھپ چھپا کر کام کرنے کے بجائے علی الاعلان کرے گا اور معنوی طور سے وہ دشمنوں پر غالب ہوگا تو ان کی ذرہ برابر پروانہ کرے گا جیسا کہ ہجرت کے وق ت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ آپ کی روش سے معلوم ہوتا ہے کہ عزم وقوت کا موقف دُشمنانِ دین کو مرغوب کر دیتا ہے اور ان کے دلوں میں رعب بٹھا دیتا ہے ۔ بلاشبہ اگر وہ لوگ قتلِ عمر رضی اللہ عنہ کی نیت کرتے تو اس میں کامیاب ہوسکتے تھے، لیکن بہادر و بے باک عمر رضی اللہ عنہ کے موقف نے ان میں سے ہر ایک کے دل میں خوف و دہشت بٹھادی اور ڈر گئے کہ مبادا ان کی ماں انہیں کھو دے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ فی الواقع برے لوگ اپنی زندگی کے حد درجہ حریص اور خواہش مند ہوتے ہیں ۔

(۲)...... جب باطل پرست دعوتِ حق کو دبانے سے عاجز آ جاتے ہیں اور مسلمان ان کے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں اور ان کے مظالم سے محفوظ ہو جاتے ہیں تو آخری چارہ کار کے طور پر وہ مصلح داعی کے قتل کا منصوبہ بنا لیتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اگر اس کو قتل کر دیں تو پوری دعوت کا بیڑہ غرق ہو جائے گا ۔ یہی ہر دور کے اشرار اور دُشمنانِ اسلام کی سازش ہوتی ہے، ہم نے یہ سازش اپنے دور میں بھی دیکھی ہے۔

(۳)...... دعوت کا سچّا اور مخلص سپاہی اپنی زندگی اپنے کمانڈر پر نچھاور کر دیتا ہے کیونکہ اس میں قائد کی دعوت کی سلامتی ہوتی ہے اور اس کی ہلاکت میں دعوت کی رسوائی اور بربادی مخفی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہجرت کی رات کو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر

سونے کے لیے راضی ہو گے اور اپنی زندگی اس راہ میں قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے ۔ کیونکہ یہ بالکل ممکن تھا کہ کفارِ قریش کے سپوتوں کی تلواریں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر پر برستیں اور ان کا کام تمام کر دیتیں، آپ ﷺ نے اس طرح اللہ کے رسول ﷺ کی نجات کو سہل بنا دیا۔لیکن آپ ﷺ نے اپنی زندگی کی قطعی فکر نہ کی ۔ان کے لیے یہ کافی تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ، اُمّت کے نبی اور دعوت کے قائد کی زندگی بچ جائے ۔

(۴)......مشرکین نے باوجود مخالفتوں اور دشمنیوں کے اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھ چھوڑی تھیں، یہ اس امر کا غماز ہے کہ دشمنانِ دین اپنے دل میں داعی کی استقامت و راست روی اور اس کی امانت داری اور صفائی و پاکیزگی پر یقین رکھتے ہیں اور یہ کہ وہ ان سے سیرت میں بلند اور کردار میں پاکیزہ تر ہے لیکن اندھی دشمنی ،جمود ،گمراہ کُن عقائد پر بے جا اصرار وہ عوامل ہوتے ہیں جو انہیں اس کی دشمنی ،اس کے خلاف کید وسازش اور اس کے قتل و ضرب پر مجبور کرتے ہیں ۔

(۵)...... قائدِ تحریک ،صدرِ مملکت یا دعوت کا لیڈر اور رہنما اگر دشمنوں اور سازشی افراد کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کرے اور اپنی جان بچانے کی پالیسی اس لیے اختیار کرے تاکہ دوسرے میدان میں اس کی تحریک مزید قوت و طاقت اور عزم و جزم کے ساتھ کام کر سکے تو یہ بزدلی ہے نہ موت سے فرار ہے نہ رُوح وجسم کی قربانی سے جی چُرانا ہے۔

(٦)......عبداللہ بن ابو بکر کا رول یہ ظاہر کرتا ہے کہ دعوتوں اور تحریکوں کی کامیابی میں نوجوانوں کا کیا کردار ہے۔ یہی لوگ ہر اصلاحی دعوت کے سُتون ہوتے ہیں اور انھی کی قربانیوں اور جاں سپاریوں کے طفیل دعوتیں اور تحریکیں نصرت اور غلبہ کی طرف آگے بڑھتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ مومنینِ سابقین سب جوان تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کے وقت عمر صرف چالیس سال تھی۔حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے تین سال کے چھوٹے تھے،حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان دونوں سے کم سن تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے چھوٹے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چھوٹے تھے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود، عبدالرحمٰن بن عوف، ارقم بن ابی ارقم، سعید بن زید، بلال بن رباح، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم سب جوان تھے۔انہوں نے اپنے کندھوں پر دعوت کی ذمّہ داریاں اُٹھائیں، اس کی راہ میں بے بہا قربانیاں دیں، اس کی خاطر مظالم برداشت کیۓ اور جان و مال کا نذرانہ بھی پیش کر دیا اور ایسے لوگوں کی بدولت ہی اسلام کامیاب ہوااوران کے بھائیوں کی کوششوں سے خلفائے راشدین کی سلطنت قائم ہوئی، شاندار اسلامی فتوحات ہوئیں اورانہی کی مسائی جمیلہ کی وجہ سے ہم تک اسلام پہنچا جس کے ذریعے اللہ نے ہمیں جہالت وضلالت، بت پرستی اور کفر وفسق سے آزاد کیا۔

(۷)......حضرت عائشہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہما نے ہجرت کے موقع پر جو کارنامہ انجام دیا اس سے عورتوں کے درمیان اصلاحی دعوت کی ضرورت و اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ صنف، نرم جذبات، اثر پذیری اور انفعالیت، رحم دلی اور پاکیزگیٔ قلب میں نمایاں ہوتی ہے اور عورت جب کسی چیز کو صحیح سمجھ لیتی ہے تو اس کی طرف دعوت دینے اور اس کی نشر و اشاعت کرنے میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتی۔ وہ اپنے شوہر، بھائی، بہنوں، بچوں سب کو اس دعوت پر مطمئن کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں اسلام کی راہ میں عورتوں کے جہاد وقربانی کے شاندار تذکرے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی تحریک ادھوری رہے گی اور معاشرے پر اس کے اثرات بہت کم ہوں گے اگر وہ عورتوں کو نظر انداز کرے گی۔اس کے برخلاف عورتیں اگر اس میں اشتراک کریں اور......نئ نسلوں کی ایمان واخلاق اور عفت وطہارت کی بنیاد پر تربیت کریں تو تحریک کہیں سے کہیں پہنچ سکتی ہے۔کیونکہ یہ صنف ان قدروں کی تبلیغ و اشاعت کی زیادہ محتاج اور مَردوں کے مقابلے میں زیادہ اس پر قادر ہے۔ یہ لڑکیاں مُستقبل میں بیویاں اور مائیں بننے والی ہیں اور چھوٹے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی تربیت و پرورش میں اسلام کی ان خواتین کا بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے ان نسلوں کو اسلامی اخلاق وآداب، اسلام اور اس کے رسول سے محبت کی بنیاد پر پروان چڑھایا

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ جن انسانوں کو جانتی ہے ان میں یہ سب سے بڑھ کر بلند ہمّت، قوی الارادہ، صاحبِ کردار اور دین و دُنیا کے معاملات میں راست باز تھے۔

آج ہمیں اس حقیقت کو سمجھنا ہے اور اس امر کے لیے بھر پور جدوجہد کرنی ہے کہ ہماری نوخیز لڑکیاں اور خواتین عورتوں میں اسلامی دعوت کا پرچم اُٹھائیں۔ ان کی تعداد نصف اُمت سے زیادہ ہے اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو تعلیمی اداروں میں شریعت کی تعلیم لینے میں جری اور بے باک بنائیں، مثال کے طور پر یہ ہماری اس یونیورسٹی میں شریعت کالج میں اس کا نظم ہونا چاہیے۔ اور جیسے جیسے ان خواتین کی تعداد بڑھتی جائے گی جو دین و شریعت سے واقف ہوں گی، تاریخ اسلام سے آشنا ہوں گی، اللہ کے رسول ﷺ سے محبت کرنے والی ہوں گی، اُمّہات المومنین رضی اللہ عنہن کے اخلاق و اطوار سے متصف ہوں گی، ہم اصلاح و دعوت کی گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھا سکیں گے اور ہم اس دن سے قریب تر ہوتے جائیں گے جب ہمارا مسلم معاشرہ اسلام کے احکام اور اس کی شریعت کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گا اور اگر اللہ نے چاہا تو یہ ہو کر رہے گا۔

(۸)...... غارِ ثور میں مشرکین قریب پہنچ کر بھی آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی کو نہ دیکھ سکے اور روایات کے مطابق دہانے پر مکڑی نے جال تیار کر دیا اور کبوتر نے انڈے دے دیئے۔ [1] تو یہ ایک مثال ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں، داعیوں اور ان کے احباب کی ہر وقت حفاظت فرماتا ہے۔ اس کی رحمت سے یہ بعید ہے کہ وہ رسول کو مشرکین کے قبضہ میں دے دے تاکہ وہ اس کا کام تمام کر دیں اور دعوت کی لٹیا ڈبو دیں۔

اس طرح اللہ اپنے مخلص بندوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ سختیوں میں ان پر مہربان ہوتا ہے اور تنگیوں سے انہیں نکال دیتا ہے اور دُشمنانِ دین جو اس کی جان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ ان کی ساری تدبیریں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ غارِ ثور میں مشرکین کے گھیراؤ کے باوجود

[1] دیکھیے حاشیہ نمبر (۱)؛ ص: ۶۹

رسول اللہ اور آپ ﷺ کے یار غار کا بچ نکلنا بس اللہ کے ان ارشادات کی صداقت کا ایک مظاہرہ تھا:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ (سورۃ المومن : ۵۱)

''یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی اِس دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اُس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (سورۃ الحج : ۳۸)

''یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں۔''

(۹)...... حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غارِثور میں مشرکین کی آمد سے گھبرا اُٹھے اور رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارک انہیں خطرے میں نظر آئی۔ یہ بے چینی ایک بہترین مثال ہے اس بات کی کہ دعوتِ دین کے ایک سچّے اور مخلص سپاہی کو اپنے امین قائد کی زندگی خطرے میں دیکھ کر کس درجہ بے چین اور مضطرب ہونا چاہیے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کا مطلق خوف نہ تھا کیونکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ اللہ کے رسول ﷺ کی رفاقت اس ہجرت میں اختیار نہ فرماتے جہاں کم ترین سزا قتل تھی اگر رسول ﷺ کے ساتھ پکڑ میں آجاتے۔ لیکن آپ کو رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی فکر تھی اور مشرکین کے قبضے میں آپ ﷺ کے چلے جانے سے اسلام کا مستقبل ڈوبتا نظر آرہا تھا اسی لیے جان کی بازی لگانے پر خوشی خوشی آمادہ ہو گئے۔

(۱۰)...... رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جواب دیا کہ'' اُن دو کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہے؟'' وہ اللہ پر حد درجہ اعتماد اور اس کی نصرت کی قوی امید کی ایک مثال تھا اس سے رسولِ اکرم ﷺ کے دعوائے نبوت کی سچائی بھی واضح ہوتی ہے۔ آپ ﷺ سخت ترین خطرے میں تھے اس کے باوجود آپ ﷺ کو کامل درجہ کا

انشراح حاصل تھا کہ جس ذات نے آپ ﷺ کو انسانوں کے لیے ہدایت و رحمت بنا کر بھیجا ہے وہ اس وقت تنہا نہیں چھوڑے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے کسی نبی اور رسول کے علاوہ دوسرے انسان کے اندر یہ اطمینان و انشراع پیدا ہوسکتا ہے؟ اسی طرح کے حالات میں داعیانِ دین اور جعلی مدعیانِ نبوت واصلاح کے درمیان فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ داعیانِ دین کے دل ہمیشہ رضائے الٰہی سے معمور ہوتے ہیں اور اس کی نصرت پر انہیں مکمل اعتماد ہوتا لیکن مدعیانِ نبوّت واصلاح خطرات و مصائب سے بھاگتے ہیں۔ شدائد سے خوف کھاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔

(۱۱)...... سراقہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلیل ہے۔ ان کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس دھنس جاتے تھے، چنانچہ جب وہ مکہ کی طرف واپس ہونے لگے تو پھر سے گھوڑا تنومند اور چست ہوگیا۔ یہ معجزہ اللہ کی طرف سے کسی نبی یا رسول کی تائید میں ہی رونما ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کا ادراک سراقہ رضی اللہ عنہ نے کرلیا اور رسول اللہ ﷺ سے امن کی درخواست کی۔ اس نے سمجھ لیا کہ رسول ﷺ کے ساتھ الٰہی طاقت ہے اس لیے انسانی طاقت آپ کو پکڑنے سے عاجز رہے گی، چنانچہ انعام چھوڑنے اور وعدہ حاصل کرنے پر وہ راضی ہو گئے۔

(۱۲)...... رسول اللہ ﷺ نے سراقہ رضی اللہ عنہ سے کسریٰ کے کنگن کا جو وعدہ کیا وہ بھی ایک معجزہ ہے۔ عام انسان جو اپنی قوم سے بھاگ رہا ہو اور جسے کہیں امان نہ مل رہی ہو وہ اور ایران کی فتح اور کسریٰ کے خزانوں پر غلبہ کا خواب نہیں دیکھ سکتا۔ الاّ یہ کہ وہ نبی اور رسول ہو چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی یہ بشارت تکمیل کو پہنچ گئی اور سراقہ رضی اللہ عنہ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اللہ کے رسول ﷺ سے وعدے کی تکمیل کا مطالبہ کیا جب انہوں نے مالِ غنیمت میں کسریٰ کے کنگن دیکھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے وہ سراقہ رضی اللہ عنہ کو پہنا دیئے۔ اور فرمایا: تمام تعریف اس اللہ کے لیے جس نے کسریٰ سے اس کے دونوں کنگن چھین

لیے اور وہ سراقہ بن جعشم اعرابی رضی اللہ عنہ کو پہنا دیئے۔ اس ہجرت میں اسی طرح یکے بعد دیگرے معجزات رونما ہوتے رہے تاکہ مسلمانوں کے ایمان و یقین میں اضافہ ہو اور شک و تردّد میں پڑے ہوئے افراد کے ذہنوں سے شک کی بدلیاں چھٹ جائیں۔

(۱۳)...... مدینہ طیبہ کے انصار و مہاجرین کو رسول اللہ کی بحفاظت و سلامتی آمد سے اتنی خوشی ہوئی کہ عورتیں اور بچیاں گھروں سے نکل پڑیں۔ اور مردوں نے کام چھوڑ دیا۔ مدینہ کے یہود اس موقعہ پر ظاہری طور پر یثرب کے مسلمانوں کی خوشی میں برابر کے شریک تھے، لیکن باطنی طور پر اس نئی قیادت کے خلاف حسد سے مغموم تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے مسلمانوں کو جو حد درجہ خوشی ہوئی، وہ تعجب انگیز نہیں ہے کیونکہ یہی ذات تھی جس نے انہیں تاریکیوں سے روشنی میں، باطل سے حق میں اور دُنیا کی تنگیوں سے آخرت کی وسعتوں میں نکالا۔ اور یہودیوں نے جو روش اپنائی وہ بھی باعثِ تعجب نہیں ہے کیونکہ جس معاشرے میں وہ غلبہ و رُعب کھو چکے ہیں اس میں چاپلوسی اور تملّق کرنے اور جوان سے لیڈری اور سرداری چھین لے اس کے خلاف بغض و حسد رکھنے میں مصروف ہیں۔ یہ عوام کو قرض دے کر ان کا خون چُوستے ہیں، نصیحت و خیر خواہی کے پردے میں ان کا خون بہاتے ہیں۔ یہود ہر اس شخص سے جلیں گے جو عوام کو ان کے تسلّط سے نکالنا چاہے۔ اور بغض و حسد سے آگے بڑھ کر اس کے خلاف سازش اور مکر کے جال بچھائیں گے پھر ممکن ہوا تو اسے قتل بھی کر دیں گے۔ یہ ان کی فطرت و عادت ہے۔ اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کو مستقر بنانے کے بعد کیا گیا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے تعاون اور اشتراک اور امن و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ لے لیا تھا، لیکن یہود ایک ایسی قوم ہے جو ہمیشہ جنگ کی آگ بھڑکائے رکھتی ہے:

﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ﴾ (سورة المائده : ٦٤)

''جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔''

(۱۴)...... ہجرت کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں بھی

قیام کیا وہاں سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کی جس میں مسلمان اکٹھا ہوسکیں۔ جب آپ ﷺ قبا میں چار روز تک ٹھہرے تو وہاں مسجد قائم کی اور مدینہ کے راستے میں جب بنی سالم بن عوف کے درمیان وادی ''رانوناء'' میں نمازِ جمعہ کا وقت ہوگیا تو وہاں بھی مسجد کی بنیاد رکھی [1] اور جب مدینہ پہنچ گئے تو سب سے پہلا کام مسجد کی تعمیر کا کیا۔

اس سے اسلام میں مسجد کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسلام میں تمام عبادات نفس کی تطہیر، اخلاق کے تزکیہ اور مسلمانوں کے درمیان وحدت اور تعاون کے رشتہ کو مضبوط کرنے کے لیے ہیں اور نمازِ با جماعت، جمعہ اور عیدین مسلمانوں کے اجتماع کا طاقتور مظہر اور ان کے اہداف و مقاصد کی وحدت اور نیکی وتقویٰ کے کاموں میں باہم دگر تعاون کی رمز اور نشان ہیں۔ بلا شبہ مسجد کو مسلمانوں کی زندگی میں اجتماعی اور روحانی حیثیت سے بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ مسجد مسلمانوں کی صفوں کو متحد رکھتی ہے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرتی ہے، ان کے دل و دماغ کو بیدار کرتی ہے، ان کی مشکلات ومسائل کو حل کرتی ہے اور ان کے درمیان قوت اور باہمی ربط کو اجاگر کرتی ہے۔ اسلام میں مسجد کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہیں سے اللہ کی ہدایات کو پھیلانے کے لیے اسلامی فوجیں روانہ ہوئیں اور اسی پاکیزہ مقام سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ہدایت اور نور کی شعاعیں پھوٹیں۔ یہیں پر اسلامی تہذیب نے نشو ونما پائی اور پروان چڑھی۔ ابوبکر، عمر، عثمان، علی، خالد، سعد، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہم اور تاریخِ اسلامی کے دوسرے بڑے بڑے ہیرو سب اسی محمدی مدرسہ کے شاگرد تھے جس کا مستقر مسجدِ نبوی تھا۔

اسلام میں مسجد کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہاں سے ہر ہفتہ خطیب کی زبان سے کلمۂ حق کی گونج سنائی دیتی ہے، منکر کے خلاف اظہارِ ناپسندیدگی ،معروف کا حکم، خیر کی دعوت، غفلت سے بیداری، اجتماعیت کی پکار، ظالم کے خلاف احتجاج، سرکش اور باغی کے خلاف تنبیہ اور اعلان یہ سب اسی منبر سے ہوتا ہے، ہم نے بچپن میں دیکھا ہے کہ فرانسیسی

---

[1] جو مسجدِ جمعہ کے نام سے موجود ومعروف ہے۔ (ابوعدنان)

استعمار کے خلاف مسجدیں وطنی تحریکوں کا مرکز تھیں۔ صیہونیت اور سامراج کے خلاف جہاد کے علمبردار انہی کا سہارا لیتے تھے اور آج جو صورتِ حال نظر آ رہی ہے کہ مسجدیں اپنی اہم ذمہ داری کی انجام دہی میں خاموش ہیں تو یہ بعض تنخواہ دار خطیبوں یا جاہلوں کی غلطی اور کوتاہ اندیشی کا نتیجہ ہے۔ جس دن مسجدوں کے منبر ومحراب کی قیادت ایسے داعیانِ حق کریں گے جو حق کے معاملہ میں سخت ہوں گے، شریعت کے عالم ہوں گے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے مخلص ہوں گے، مسلمانوں اور عوام کے خیر خواہ ہوں گے، اس وقت ہماری اجتماعی زندگی میں مسجد کی مرکزیت واپس آجائے گی اور افراد کی تعمیر و تربیت، سورماؤں کی تیاری، فسادات اور منکرات کے خاتمے اور معاشرہ کی تقویٰ اور رضائے الٰہی کی بنیادوں پر تعمیر کے سلسلے میں مسجدیں اپنا کردار ادا کرنے لگیں گی اور ہمیں اس وقت یہ خواب حقیقت نظر آجائے گا جب ہماری نوجوان نسل جو اللہ کے دین سے واقفیت رکھے، اور رسول اللہ ﷺ کے اخلاق سے متصف ہو، مسجدوں کے منبر ومحراب پر قابض ہو جائے گی۔

(۱۵)...... انصار ومہاجرین کی مؤاخات و بھائی چارگی اسلام کے انسانی عدل اور تعمیری اخلاقیات کا بہترین مظہر ہے۔ مہاجرین وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی سرزمین چھوڑ دی اور مدینہ اس حال میں پناہ گزیں ہوئے کہ مال و جائیداد کی ایک کوڑی بھی نہ رکھتے تھے اور انصار وہ لوگ تھے جو اپنی کھیتیوں، صناعت اور دولت کی وجہ سے خوشحال تھے۔ ہر بھائی اپنے بھائی کا بوجھ اُٹھائے، اس کی خوش حالی و بدحالی میں ساتھ دے، گنجائش ہو تو اسے اپنے گھر میں پناہ دے، دولت مند ہو تو نصف مال اس کے حوالے کر دے بھلا بتائیے کونسی دُنیا کی اجتماعی عدالت اس اخوت اور بھائی چارگی کی ہمسر ہو سکتی ہے؟

جو لوگ بات پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ اسلام میں اجتماعی عدل (SOCIAL JUSTICE) ہے وہ نہیں چاہتے کہ اسلام کی روشنی لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کرے اور ان کے دلوں پر قابض ہو جائے۔ یہ لوگ جمود پسند ہیں ہر جدید لفظ کو ناپسند کرتے ہیں چاہے عوام

اسے پسند کرتے ہوں اور اسلام میں اس کی دلیل موجود ہو۔ ورنہ اسلام میں عدالت اجتماعی کا انکار کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اس کی تاریخ میں یہ شاندار اخوت موجود ہے اور اسے خود صاحبِ شریعت ﷺ نے قائم کیا تھا، اشراف پر اسے نافذ کیا تھا اور اس کی بنیاد پر پہلی سوسائٹی تشکیل دی اور اسے پروان چڑھایا تھا؟ یہ تو ایک عظیم بہتان ہے جس سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں!

(۱۶)...... انصار ومہاجرین کے درمیان اخوت کا جو معاہدہ آپ ﷺ نے کرایا اور اس کے لیے جو تحریر تیار فرمائی اس میں عدلِ اجتماعی کی بنیاد پر قائم معاشرہ کے لیے سارے نشانات راہ موجود ہیں اور یہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی بنیاد معاہدۂ صلح ہے جب تک وہ اس کے پابند ہوں اور یہ کہ حق و عدل، برّ وتقویٰ میں تعاون، معاشرے سے بدمعاشوں اور اشرار کو ختم کرنے کی کوشش، یہ وہ اہم اور نمایاں اصول ہیں جن کا اسلامی مملکت اعلان کرتی ہے اور اس طرح اسلامی مملکت ہر جگہ اور ہر دور میں بہترین اور عادلانہ اصولوں پر قائم رہ سکتی ہے۔ اس میں وہ سارے پاکیزہ اور عادلانہ اصول موجود ہیں جن پر سلطنتوں کا قیام ہے اور جن کے سائے میں قومیں زندگی بسر کرتی ہیں۔ آج مسلم معاشرے میں مملکت کے قیام کا کام، جس کے اصول اسلام کی روشنی میں طے کیئے جائیں، ایسا کام ہے جو مملکت کے مفہوم میں پیدا ہونے والی جدید انسانی فکر سے ہم آہنگ ہے۔ بلکہ یہ نظام مسلمانوں کے لیے ایسا معاشرہ تعمیر کرتا ہے جو سارے معاشروں سے مضبوط و مستحکم، ترقی یافتہ اور مکمل وسعادت خیز ہوتا ہے۔

کچھ بھی ہو ہمارا مفاد اسی میں ہے کہ ہم اپنی مملکت کی تعمیر اسلام کی بنیاد پر کریں اور اس کو چھوڑ دینے میں ہماری تباہی و بربادی ہے اور اسلام اسلامی وطن میں غیر مسلموں کو تکلیف نہیں پہنچاتا، ان کے عقائد پر جبر نہیں کرتا نہ ان کے حقوق چھینتا ہے، پھر آخر کس خوف کی وجہ سے مسلم ممالک میں اسلام کے احکام اور قوانین نافذ نہیں کیئے جاتے؟ جبکہ اسلام عدل، سچائی، قوت، اور اخوت کا پیامبر اور محبت وتعاون، شفقت و بھائی چارگی کی بنیاد پر اجتماعی تکافل وتعاونِ باہمی کا علمبردار ہے؟ ہم اسلام ہی کے ذریعے گلوخلاصی کرا سکتے ہیں

اس لیے کام کرنے والوں کو آگے بڑھنا چاہیے:۔

﴿وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ﴾ (سورة الاعراف : ٩٦)

''اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم اُن پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔''

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ﴾ (سورة الانعام : ١٥٣)

''یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں متفرّق و پراگندہ کر دیں گے۔''

﴿وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾﴾ (سورة الطلاق : ٢تا٣)

''جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا، اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لیے وہ کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے، اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔''

﴿وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ﴿۴﴾﴾ (سورة الطلاق : ٤)

''جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملے میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے۔''

﴿وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَ يُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ﴿۵﴾﴾ (الطلاق : ٥)

''جو اللہ سے ڈرے گا، اللہ اس کی بُرائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا۔''

دورِ رسالت کے معرکے

تاریخی واقعات

❁ ......غزوۂ بدر
❁ ......غزوۂ اُحد
❁ ......غزوۂ بنی نضیر
❁ ......غزوۂ احزاب
❁ ......غزوۂ بنی قریظہ
❁ ......صلح حدیبیہ
❁ ......غزوۂ خیبر
❁ ......غزوۂ موتہ
❁ ......فتح مکّہ
❁ ......غزوۂ حنین
❁ ......غزوۂ تبوک

عبرت و نصیحت

تاریخی واقعات

نبی اکرم ﷺ نے مدینہ کو اپنا دعوتی مُستقر بنائے رکھا حتّٰی کہ مسلمانوں اورقریش اور ان کے حلیفوں کے مابین معرکہ آرائیاں ہونے لگیں۔ مسلم موّرخین نے ہراُس معرکہ کو جو مسلمان اور مشرکین کے درمیان لڑی گئی اور نبی اکرم ﷺ بنفسِ نفیس اس میں خود موجود تھے، ''غزوہ'' کا نام دیا ہے اور ہر وہ جھڑپ جو فریقین میں ہوئی اور اس میں آپ ﷺ خود موجود نہ تھے، اسے ''سَریّہ'' کے لفظ سے یاد کیا ہے، غزوات کی تعداد چھبیس (۲۶) تک اورسَرایا کی تعداد اڑتیس ۳۸ تک پہنچتی ہے۔ یہاں ہم گیارہ مشہور غزوات کا ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے۔

(۱) غزوۂ بدر:

ہجرت کے دوسرے سال ۱۷/ رمضان کو یہ جنگ لڑی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اصحابِ رسول ﷺ نے شام سے مکہ واپس آنے والے تجارتی قافلے سے چھیڑ چھاڑ کرنی چاہی، جنگ کا ارادہ قطعی نہ تھا، لیکن یہ تجارتی قافلہ جس کی قیادت ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی، بچ بچا کر نکل گیا، دوسری طرف اس نے قریش سے قافلہ کی مدافعت کے لیے دہائی بھی دے ڈالی چنانچہ قریش ایک ہزار جنگجو لے کر نکلے جس میں چھ سو زرہ پوش، سو گھوڑے جن پر زرہ پوش سوار تھے، اور سات سو اونٹ تھے اور ساتھ میں دوشیزائیں بھی تھیں جو دف بجا رہی تھیں اور مسلمانوں کی ہجو و مذمت کے نغمے گا رہی تھیں۔

مسلمانوں کے پاس کل تین سو تیرہ افراد تھے۔ ان میں اکثریت انصار کی تھی ان کے

ساتھ ستّر (۷۰) اونٹ اور گھوڑے تھے بلکہ گھوڑوں کی تعداد صرف تین تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سواری کی کمی کی وجہ سے باری باری ایک ہی اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ معرکہ میں گُھسنے سے پہلے آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنا چاہا۔ مہاجرین نے جنگ کی خواہش ظاہر کی اور حمایت کا بھرپور یقین دلایا۔ پھر انصار نے بھی اس حمایت اور تائید کا یقین دلایا۔ انصار کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ کا روئے سخن ہم لوگوں کی طرف ہے، میں انصار کی طرف سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ آپ ﷺ جہاں چاہیں روانہ ہوں، جس سے چاہیں تعلق فرمائیں اور جس سے چاہیں ختم کریں، ہمارے مال و دولت میں سے جتنا چاہیں لیں اور ہم کو جتنا پسند ہو عطا فرمائیں، اس لیے کہ آپ جو کچھ لیں گے وہ ہمیں اس سے کہیں زیادہ محبوب ہوگا جو آپ ﷺ چھوڑیں گے۔ آپ ﷺ کوئی حکم دیں گے تو ہماری رائے آپ ﷺ کے تابع فرمان ہوگی۔ اللہ کی قسم! اگر آپ چلنا شروع کریں یہاں تک کہ ''برک الغماد'' تک پہنچ جائیں تب بھی ہم آپ ﷺ کے ساتھ چلتے رہیں گے اور اللہ کی قسم! اگر آپ ﷺ اس سمندر میں داخل ہو جائیں گے تو ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ کود جائیں گے۔

جب رسول اللہ نے یہ گفتگو سنی تو چہرۂ انور دمکنے لگا اور فرمایا:

> ''اللہ کی برکت کے ساتھ چلو اور بشارت حاصل کرو۔ اللہ نے مجھ سے دو گروہوں میں سے ایک پر فتح کا وعدہ کیا ہے یا تو قافلۂ تجارت کا یا میدان جنگ میں دشمنوں پر غلبہ کا۔''

پھر آپ ﷺ روانہ ہوئے یہاں تک کہ میدانِ بدر کے چشمہ کے قریب پہنچ گئے۔ حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا اس منزل پر ہمارا پڑاؤ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے جس میں کوئی ردّ و بدل ہمارے لیے جائز نہیں یا اس کا تعلق جنگی حکمتِ عملی اور تدبیر و انتظام سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''یہ تدبیر و حکمت کی بات ہے اور اس میں دُشمن کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔''

تب انہوں نے کہا: پھر میں عرض کروں گا کہ یہاں پڑاؤ اس نقطۂ نظر سے مناسب نہیں ہے، انہوں نے ایک دوسرے مقام کی نشاندہی کی جو جنگ کے لیے زیادہ موزوں تھا، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ اس مقام کی طرف چلے اور اس جگہ قیام کیا جو پانی سے قریب تر تھا۔ پھر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ مسلم دستوں کے عقب میں رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک ٹیلہ پر چھپّر ڈال دیا جائے تاکہ اگر ہمیں جنگ میں فتح نصیب ہو تو زہے قسمت ورنہ مدینہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ہم سے کم آپ ﷺ سے محبت نہیں رکھتے آپ ان سے جا ملیں گے۔ اگر ان لوگوں کو یقین ہوتا کہ جنگ ضرور ہوگی تو وہ پیچھے نہ رہتے نبی ﷺ نے ان لوگوں کے حق میں دُعا فرمائی اور چھپّر ڈالنے کا حکم دیا اور جب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو رسول ﷺ اللہ مسلمانوں کی صف بندی کرنے لگے، انہیں جنگ پر آمادہ کرنے لگے اور شہادت کی ترغیب دلانے لگے اور فرمایا:

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے آج کوئی بھی جنگ کرے گا، اور صبر اور رضائے الٰہی کی طلب میں قتل کر دیا جائے گا، میدانِ جنگ سے فرار نہیں اختیار کرے گا اسے اللہ ضرور جنت میں داخل کرے گا۔''

پھر آپ ﷺ اپنے جھونپڑے کی طرف پلٹے اور آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی تھے اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ننگی تلوار سے آپ ﷺ کی نگرانی کر رہے تھے۔ رسول ﷺ اللہ رب العزت سے دُعا و مناجات میں لگ گئے۔ اپنے رب کو یوں پکارا:

''اے اللہ، میں تجھے تیرا عہد اور وعدہ یاد دلاتا ہوں اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت فنا ہوگئی تو پھر قیامت تک اس سرزمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔''

بڑی دیر تک سجدے میں پڑے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: بس اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرور اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ پھر جنگ شباب پر پہنچ گئی اور

مسلمانوں کی فتح اور غلبہ پر ختم ہوئی۔ مشرکین کے ستّر آدمی کھپت (واصلِ جہنم) ہوئے ان میں ابوجہل اور ان کے بعض لیڈر ساتھی بھی تھے۔ اور ستّر کے قریب زندہ گرفتار ہوئے، پھر آپ نے تمام مقتولین کو دفن کرنے کا حکم دیا اور مدینہ لوٹ آئے۔ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے قیدیوں کے متعلق دریافت کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب کو قتل کرنے کا مشورہ دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فدیہ پر چھوڑ دینے کی تجویز پیش کی چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تجویز قبول کر لی اور مشرکین نے اپنے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑا لیا۔

غزوۂ بدر پر اللہ تعالیٰ نے مختلف آیات میں تبصرہ کیا۔ آل عمران میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۝﴾ (سورۃ آل عمران: ۱۲۳ تا ۱۲۷)

''(جنگِ) بدر میں اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی جبکہ تم اس وقت بہت کمزور تھے لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو۔ امید ہے کہ تم شکرگزار بنو گے۔ (اے نبی!، یاد کرو) جب تم مؤمنوں سے کہہ رہے تھے'' کیا تمہاری لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے''؟...... بے شک، اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے اُسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحبِ نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمہیں اس لیے بتا دی ہے کہ

تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے (اور یہ مدد تمہیں اس لیے دے گا) تا کہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔''

اسی طرح قیدیوں کو فدیہ کے عوض چھوڑ دینے پر رسول اللہ ﷺ پر یوں عتاب نازل ہوا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

(سورة الانفال : ٦٧ تا ٦٩)

''کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین (میدانِ جنگ) میں دُشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دُنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر آخرت ہے، اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

(۲) غزوۂ اُحد:

ہجرت کے تیسرے سال ماہ شوال کے وسط میں یہ غزوہ واقع ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش نے بدر کا انتقام لینا چاہا اور اس کے لیے برابر تیاریاں کرتے رہے حتیٰ کہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کے لیے یہ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس لشکر میں قریش

کے حبش کے حلیفوں کے علاوہ تین ہزار جنگجو تھے جس میں سات سو زرہ پوش اور دو سو شہ سوار تھے۔ اس کے ساتھ سترہ عورتیں بھی تھیں جو اپنے محمل میں اس لشکر کے ساتھ اس غرض سے بھیجی گئی تھیں کہ مردان کی وجہ سے راہِ فرار نہ اختیار کرسکیں ان میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بھی تھی، جس کا باپ وغیرہ جنگِ بدر میں مارے گئے تھے۔ غرض یہ لشکر روانہ ہوا اور اُحد پہاڑ کے دامن میں پناہ گزیں ہوگیا۔

رسول اللہ ﷺ اور کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے تھی کہ مسلمان مدینہ ہی میں رہیں اور ان لوگوں سے کوئی تعرض نہ کریں، اگر وہ خود حملہ کریں تو ان سے قتال کریں، لیکن بعض نوجوانوں اور ان مسلمانوں نے جو بدر کی جنگ میں شریک نہیں ہو سکے تھے اور اُن کو اس کی حسرت رہ گئی تھی، باہر نکل کر جنگ کرنے پر اصرار کیا چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی رائے مان لی اور گھر میں داخل ہوئے اور زرہ پہن لی اور ڈھال پشت پر ڈال لیا اور ہاتھ میں نیزہ لے لیا، پھر مسلمانوں کے درمیان تلوار حمائل کرتے ہوئے آئے تو اس وقت ان لوگوں کو جو باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے داعی تھے ندامت ہوئی اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی مرضی کے خلاف اس کام پر آمادہ کیا ہے جو ہمیں نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر آپ ﷺ چاہیں تو یہیں تشریف رکھیں اور یہیں رہ کر مقابلہ کریں۔ رسول ﷺ اللہ نے فرمایا:

”نبی کی شان یہ نہیں ہوتی کہ مسلّح ہونے کے بعد جنگ سے پہلے ہتھیار رکھ دے تا آنکہ اللہ اس کے اور دشمنوں کے درمیان فیصلہ فرما دے۔“

پھر رسول اللہ ﷺ ایک ہزار صحابیوں کے ساتھ مقابلہ کے لیے تشریف لے چلے۔

جب مسلمان خروج کے لیے اکٹھا ہوگئے تو رسول نے یہودیوں کی ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ عبداللہ بن اُبی بن سلولی منافقوں کے سردار کے ساتھ واپس جارہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا یہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے؟ لوگوں نے کہا: نہیں، اے اللہ کے رسول ﷺ!

فرمایا: ان سے کہو، چلے جائیں ہم مشرکوں کی مدد نہیں چاہتے۔ پھر آدھے راستے میں عبداللہ بن ابی بھی تین سو منافقوں کے ساتھ آپ کو چھوڑ کر واپس چلا گیا اور مسلمانوں ی تعداد صرف سات سو رہ گئی۔ آپ ﷺ نے اپنی پشت اُحد کی طرف کی اور لشکر کو بھی اسی حساب سے تعینات کیا۔ ہر دستے کا ایک قائد مقرر کیا اور پچاس تیر اندازوں کا انتخاب کیا تا کہ وہ مسلمانوں کے لشکر کے پیچھے مشرکین کے حملوں سے باخبر رہیں اور انہیں تاکید کی کہ وہ تیر اندازی کے ذریعہ گھوڑ سواروں کی پیش قدمی روکیں اور اس کا خیال رکھیں کہ وہ ہماری پشت پر نہ آ جائیں خواہ جنگ کا پاسہ ہمارے حق میں ہو یا ہمارے خلاف ہو۔ آپ ﷺ نے انہیں یہ ہدایت کی کہ وہ اپنی پوزیشن کسی حالت میں بھی نہ چھوڑیں اور اس جگہ سے ہرگز نہ ہٹیں خواہ چڑیاں مسلمانوں کے لشکر کو اُچک لے جائیں۔

پھر جنگ شروع ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو دشمنوں کے خلاف فتح عطا کی۔ بہتیرے مشرکین کو انہوں نے تہِ تیغ کیا اور انہیں سخت ہزیمت اٹھانی پڑی اور مسلمان مشرکین کا مال غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے یہ دیکھ کر تیر اندازوں نے اپنی پوزیشن چھوڑ دی اور لشکر سے آ ملے۔ ان کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں رسول کی وصیّت اور تاکید یاد دلائی۔ انہوں نے جواب دیا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور اب یہاں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مشرکین کی میمنہ کے کمانڈر خالد بن ولید نے یہ صورت حال دیکھی تو پیچھے سے حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کو اس وقت ہوش آیا جب مشرکین کی تلواریں ان کا صفایا کرنے لگیں۔ اس موقع پر وہ سخت تشویش میں مبتلا ہو گئے، اسی وقت یہ پروپیگنڈہ کر دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے۔ یہ خبر سنتے ہی بعض مسلمان مدینہ کی طرف بھاگے اور مشرکین رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئے اور آپ ﷺ پر سنگ باری شروع کر دی یہاں تک کہ پتھر کی چوٹ سے آپ ﷺ گر پڑے، سامنے کے چار دانت شہید ہو گئے، سرِ مبارک میں زخم آیا اور لب مبارک خون آلود ہو گئے۔ خون چہرۂ انور پر بہہ رہا تھا۔ مشرکین آپ ﷺ

کو قتل کرنے کے لیے چڑھے چلے آ رہے تھے، لیکن آپ ﷺ اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم جمے رہے جن میں حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہوگئے تھے۔ چنانچہ تیر اُن پر گرتے رہے، یہاں تک کہ پیٹھ تیروں سے چھلنی ہوگئی۔ ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے، جو اُسی جگہ کھڑے نبی ﷺ کے دفاع میں تیر چلا رہے تھے، تقریباً انہوں نے ایک ہزار تیر چلائے۔ ان میں نسیبہ اُم عمارہ انصاریہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، جنہوں نے پانی پلانے کا کام چھوڑ دیا اور تلوار لے کر آپ ﷺ کے دفاع میں کھڑی ہوگئیں یہاں تک کہ ان کی گردن میں تیر لگا اور وہ شدید زخمی ہوگئی۔ ان کے ساتھ ان کے شوہر اور دونوں بیٹے بھی تھے۔ ان سے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تمھارے گھر والوں پر اللہ برکت نازل فرمائے۔ نسیبہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا۔ اللہ سے دعا کیجئے کہ ہمیں آپ ﷺ کی معیّت جنت میں بھی حاصل ہو۔ آپ ﷺ نے دعا کی: اے اللہ! تو انہیں جنت میں میرا رفیق بنا۔ اس کے بعد اُس بہادر خاتون نے فرمایا۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ دُنیا میں میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں آپ ﷺ کا بیان ہے کہ میں دائیں بائیں جس جانب بھی نگاہ اٹھاتا تھا، انہیں اپنی حفاظت میں جنگ کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اس دن انہیں نیزوں اور تلواروں سے بارہ زخم آئے۔

تنگی کے وقت ابی بن خلف نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ کر آپ ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے قسم کھائی کہ محمد (ﷺ)! اگر تم زندہ رہے تو میری خیر نہیں۔ آپ ﷺ نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے نیزہ لے کر اس کی گردن میں مارا۔ نیزہ لگتے ہی اس نے گھوڑے سے گر کر قلابازیاں کھائیں اور موت کے منہ میں پہنچ گیا۔ تمام جنگی مہموں میں یہ تنہا شخص ہے جسے آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

پھر رسول اللہ نے حضرت طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔ اے اللہ! ہمیں جو کچھ قوت حاصل ہے وہ تیرے واسطے سے ہے اور معرکہ ختم ہوگیا. چلتے وقت

ابوسفیان نے آواز لگائی۔آئندہ سال بدر میں پھر ہمارا تمہارا مقابلہ ہے۔

اس جنگ میں آپ کے چچا اور رضاعی بھائی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شہید ہوگئے۔ ابو سفیان کی بیوی ہند نے آپ رضی اللہ عنہ کا مثلہ کر ڈالا اور آپ کا کلیجہ چبا گئی، پھر تلخی محسوس کر کے تھوک دیا۔ آپ ان کی شہادت سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا: اگر اللہ نے کہیں قریش پر مجھے غلبہ عطا کیا تو میں ان کے تیس آدمیوں کا مثلہ کرادوں گا۔لیکن اس کے بعد اللہ نے مثلہ کرنے سے روک دیا......

اس جنگ میں مسلمان شہداء کی تعداد ستر (۷۰) تھی اور مشرک مقتولین کی تعداد تیئیس ۲۳ تھی۔اس معرکہ کے سلسلے میں اللہ نے متعدد آیات نازل کیں جن میں اس جنگ پر تبصرہ کیا اور شکست کے اسباب بتائے۔سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۝ وَ لِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ۝ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۝﴾ (سورة آل عمران : ۱۳۹ تا ۱٤۲)

’’دل شکستہ نہ ہو،غم نہ کرو،تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔اُس وقت اگر تم کو چوٹ لگی ہے تو اِس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب وفراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے لیے گردش دیتے رہتے ہیں۔تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو (واقعی راستی کے) گواہ ہوں کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں...... اور وہ اِس آزمائش کے ذریعے

مؤمنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔''

پھر چند آیات کے بعد کہتا ہے:

﴿وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَ لَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (سورۃ آل عمران: ۱۵۲ تا ۱۵۳)

''اللہ نے (تائید ونصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتداء میں اِس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے، (یعنی مالِ غنیمت) تم (اپنے سردار کے حکم کی) خلاف ورزی کر بیٹھے...... اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دُنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے...... تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے اور حق یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں پھر بھی معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے۔ یاد کرو جب تم بھاگے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے کا ہوش

تمہیں نہ تھا اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لیے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے''۔

(۳) غزوۂ بنی نضیر:

یہ یہود کا بہت بڑا قبیلہ تھا، جو مدینہ کے اطراف میں رہتا تھا۔ یہ خزرج کے حلیف تھے اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان صلح کا معاہدہ ہو چکا تھا، لیکن یہود میں پائی جانے والی طبعی شرارت اور بدعہدی نے انہیں نقضِ عہد پر مجبور کر دیا...... چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے چند صحابہ رضی اللہ عنہم ایک کام کے سلسلے میں ان کے ایک گھر کی دیوار کے نیچے تشریف فرما تھے کہ انہوں نے یہ سازش کی کہ ایک آدمی اوپر چڑھ کر ایک بھاری پتھر لڑھکا دے تو اس شخص سے چھٹی مل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ان کے ناپاک ارادوں کا علم عطاء فرما دیا۔ آپ ﷺ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ روانہ ہو گئے، یہاں آ کر آپ ﷺ نے ان سے جنگ کی تیاری شروع کر دی اور چھ راتوں تک ان کا محاصرہ جاری رکھا۔ چنانچہ مرعوب ہو کر انہوں نے خود درخواست کی کہ آپ ﷺ ان کو یہاں سے جلاوطن کر دیں، لیکن ان کو جان کی امان دے دیں، اونٹ جتنے لے جاسکیں ان کو لے جانے کی اجازت ہو گی، البتہ ہتھیار وہ منتقل نہ کرسکیں گے۔ آپ ﷺ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمالی اور وہ سارا سامان اپنے ساتھ لے گئے جو اونٹوں پر جا سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے گھر ڈھا دیئے تاکہ مسلمان انہیں استعمال نہ کرسکیں۔ چنانچہ وہاں سے روانہ ہو گئے، کچھ مدینہ سے سو (۱۰۰) میل کی مسافت پر خیبر میں پناہ گزیں ہو گئے اور کچھ یہودی شام کے جنوب میں 'جرش' میں خیمہ زن ہو گئے صرف دو آدمیوں نے مصالحت کی۔

اس غزوۂ کے سلسلہ میں سورۂ حشر نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۗ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾ (سورة الحشر : ٢ تا ٤)

''وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کافروں کو پہلے ہی ہلّے میں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تمہیں ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کے قلعے انہیں اللہ سے بچالیں گے، مگر اللہ ایسے رُخ سے اُن پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا، اس نے ان کے دلوں میں رُعب ڈال دیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مؤمنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!۔ اگر اللہ نے اُن کے حق میں جلا وطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

(۴) غزوۂ احزاب

اسے غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔ یہ ماہِ شوال ۵ھ میں پیش آیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جب بنونضیر کی جلاوطنی مکمل ہوگئی تو ان کے کچھ سردار مکہ آئے اور قریش کو رسول اللہ کے خلاف اکسایا، انہوں نے لبیک کہی، پھر وہ قبیلہ غطفان کے سرداروں سے ملے تو بنوفزارہ، بنو

مرّہ اور اشجع نے ہاں میں ہاں ملائی اور یہ سب مل کر مدینہ کی طرف بڑھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جب ان کے خروج کی بابت خبر سنی تو اپنے ساتھیوں سے مشورہ چاہا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے کا مشورہ دیا، چنانچہ آپ ﷺ نے ان مشورہ تسلیم کر کے خندق کھودنے کا حکم دیا اور خود مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودنے میں شریک ہوئے۔ جب قریش اور دوسری جماعتیں مدینہ پہنچیں تو خندق دیکھ کر گھبرا گئیں، اس لیے کہ عربوں کے ہاں اس طرح کا کوئی رواج نہ تھا۔ ان کی نفری دس ہزار کی تھی اور مسلمان کل تین ہزار کی تعداد میں تھے۔ حُیَیّ بن اخطب اُن یہودیوں میں سے تھا جنہوں نے قریش اور دوسرے قبیلوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا تھا۔ وہ بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا اور اس سے مسلمانوں کے معاہدے کو توڑنے کی درخواست کی۔ چنانچہ وہ مختلف طریقوں سے انہیں آمادہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ معاہدہ توڑ دینے پر تیار ہو گئے اور جنگجو جماعتوں میں وہ بھی شامل ہو گئے۔ اب مسلمانوں کے لیے معاملہ اور سخت ہو گیا اور نبی ﷺ نے بنو قریظہ سے مدینہ کی تہائی فصل پر معاہدہ کرنے کو سوچا، لیکن انصار نے عرض کیا کہ جس وقت ہم لوگ شرک و بت پرستی کی آلودگیوں میں پڑے ہوئے تھے، نہ ہم اللہ کی عبادت کرتے تھے نہ اس کو پہچانتے تھے، اس وقت کھجور کا ایک دانہ بھی ہم ان کو دینے کے روادار نہ تھے اور اب اسلام لانے اور ہدایت پانے کے بعد کیا اپنا مال ہم ان کو دے دیں گے؟ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ بعض مشرکین نے خندق کی چوڑائی جہاں بہت کم تھی، وہاں پہنچ کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور خندق پار کر گئے اور اس طرح جنگ شروع ہو گئی اور مسلمانوں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ اسی پریشانی کے عالم میں اچانک نعیم بن مسعود غطفانی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اسلام لانے کی خبر دی اور فرمایا: اے اللہ کے رسول ﷺ، میری قوم کو میرے اسلام لانے کا علم نہیں ہے اب جیسا منشا ہو ارشاد فرمائیں۔ رسول ﷺ نے فرمایا: تم اکیلے آدمی ہو تم وہیں رہ کر ہماری مدد کرو کیونکہ جنگ حیلہ و تدبیر کا نام ہے۔ نعیم رضی اللہ عنہ

نے اپنی چالاکی اور ہوش مندی سے قریش اور ان کے حلیفوں اور بنو قریظہ کے مابین انتشار اور پھوٹ ڈال دی اور ہر فریق کے دلوں میں دوسرے فریق کے خلاف شک و شبہ اُبھار دیا۔ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان دُشمنوں کی فوجوں پر ان سرد و یخ بستہ راتوں میں ایسی تیز ہوا چلی کہ ان کی قیام گاہیں اکھڑ گئیں اور دیگچیاں اُلٹ گئیں اور سارے قبیلے رُعب میں مبتلا ہو گئے اور اسی رات بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب صبح ہوئی تو مسلمانوں نے دیکھا کہ میدان صاف ہو چکا ہے.............۔

اس غزوۂ پر اللہ نے اپنی معزز کتاب میں تبصرہ فرمایا:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝﴾ (سورة الاحزاب: ۹ تا ۱۱)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اس نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔ جب دُشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے، جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے، اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے، اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ منافقین کی روش اور فرارِ جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے اس کے بعد مسلمانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿ وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ؕ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۙ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۚ﴾ (سورۃ الاحزاب : ۲۲ تا ۲۵)

''اور سچے مؤمنوں (کا حال اس وقت یہ تھا کہ) جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ ''یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچّی تھی۔'' اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھایا۔ ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیئے ہوئے عہد کو سچّا کر دکھا دیا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے، انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی (یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کرلے، بیشک اللہ غفور رّحیم ہے۔ اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا، وہ کوئی فائدہ حاصل کیئے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یونہی پلٹ گئے، اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا۔ اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔''

(۵) غزوۂ بنوقریظہ:

غزوۂ احزاب کے بعد ۵ھ میں واقع ہوا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ بنوقریظہ مسلمانوں سے عہد شکنی اور قریش سے اتحاد و دوستی کر چکے ہیں اور غزوۂ احزاب میں معاہدہ

توڑنے کا اعلان کر چکے ہیں جو مسلمانوں کے لیے سخت ترین حالات لے کر آیا تھا اور اللہ نے مدد نہ کی ہوتی تو اس جنگ میں مسلمانوں کا صفایا ہو چکا ہوتا، تو آپ ﷺ نے ان غدّاروں اور خائنوں کو مزہ چکھانے اور ان کو ادب آداب سکھلانے کی ضرورت محسوس کی تاکہ جہاد و دعوت کے اس جدید مُستقر مدینہ سے ان کا وجود ختم ہو جائے اور دوبارہ اس طرح کی غدّاری کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے اور وہ مسلمانوں کی پیٹھ میں دوبارہ خنجر نہ گھونپ سکیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بیان کی ہے کہ جب اللہ کے رسول خندق سے واپس ہوئے اور ہتھیار اتار کر غسل فرمالیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ ﷺ نے ہتھیار رکھ دیئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ، ہاں...... اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ فرشتوں نے اپنے ہتھیار نہیں رکھے۔ اللہ عزّ وجل نے آپ ﷺ کو حکم دیا ہے کہ بنی قریظہ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک منادی کرنے والے کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ وہ لوگوں میں جا کر اعلانِ عام کرے کہ ہر اس شخص کو جو سُننے والا اور ماننے والا ہے یہ چاہیئے کہ نمازِ عصر بنی قریظہ میں پڑھے۔ [1]

پھر آپ ﷺ روانہ ہوئے۔ علمبر دار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ تین ہزار فوج تھی۔ چھتیس گھوڑے تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ بنی قریظہ کے قلعہ کے قریب پہنچے تو ان کی جانب سے آپ ﷺ اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی شان میں نازیبا الفاظ سنائی دیئے۔ فوراً نبی ﷺ کو اس سے باخبر کیا اور خواہش ظاہر کی کہ ان خبیثوں کے قریب نہ جائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے دیکھنے کے بعد بے سر دپا باتیں نہیں کریں گے کیونکہ نفاق اور چاپلوسی ان کے اخلاق میں رچ بس چکی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا جب انہوں نے آپ ﷺ کو دیکھا تو نرم پڑ گئے۔ پھر مسلمانوں نے پچیس دن تک ان کا محاصرہ جاری رکھا یہاں تک کہ اس محاصرہ سے وہ تنگ آ گئے اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ آپ ﷺ نے سعد

---

[1] بخاری:٤١١٩ .

بن معاذ کوحَکَم بنایا کیونکہ اس لیے کہ بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حلیف تھے، لیکن سعد رضی اللہ عنہ نے فیصلہ سنایا کہ ان کے جنگ جو مرد قتل کردیئے جائیں، ان کا مال تقسیم کرلیا جائے، بچے اور عورتیں غلام بنا لیے جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی فیصلے کو نافذ فرمایا۔ اور اس طرح یہودیوں کی سازشوں اور شرارتوں کا خاتمہ ہوگیا۔

اس غزوہ کے سلسلہ میں قرآن کریم کی آیات نازل ہوئیں جنہوں نے یہودیوں کی غداریوں، ان کی بدمعاشی اور نقض عہد پر تبصرہ کیا اور ان کی ذلت و رُسوائی کا علی الاعلان تذکرہ کیا:

﴿وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛؕ وَ مَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَ مَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا يَسِيْرًا ۝ وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ۝ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾

(سورة الاحزاب: ١٣ تا ١٦)

”جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو، تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو۔ جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبی سے رُخصت طلب کر رہا تھا کہ ”ہمارے گھر خطرے میں ہیں حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے، دراصل وہ (محاذ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دُشمن گھس آئے ہوتے اور اس وقت انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو یہ اُس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریک فتنہ ہونے میں کوئی تامل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ یہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور اللہ سے کیئے گئے عہد کی باز پرس تو ہونی ہی تھی۔ (اے نبی!) ان سے کہو، اگر تم

موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لیے، کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمہیں مل سکے گا۔''

یہاں تک کہ اس نے فرمایا:

﴿وَ اَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ﴿٢٦﴾ وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢٧﴾﴾ (سورة الاحزاب : ٢٦ تا ٢٧)

''پھر اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا، اللہ ان کے قلعوں سے انہیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو۔ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

(٦) صلح حدیبیہ:

٦ھ میں یہ صلح ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا طواف کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ عمرہ کے لیے تیار ہو جائیں۔ آپ ﷺ کا مقصد قریش سے چھیڑ خوانی یا جنگ ہرگز نہ تھا، چنانچہ انصار و مہاجرین کو چھ سال کی مسلسل محرومی کے بعد جب یہ حکم ملا تو ان کی آتشِ شوق بھڑک اُٹھی اور وہ سب آپ کے ساتھ روانہ ہونے پر آمادہ ہو گئے اور بہت سے بدّو بھی عمرہ کی نیت سے آپ ﷺ کے ساتھ ہو گئے اور قربانی کے جانور بھی آپ نے ساتھ لے لیے اور ذوالحلیفہ میں پہنچ کر عمرہ کا احرام باندھ لیا تاکہ لوگوں کو اس کا علم ہو جائے کہ آپ ﷺ صرف زیارتِ بیت اللہ کی غرض تشریف لے جا رہے ہیں، آپ ﷺ کے ساتھ لگ بھگ چودہ سو آدمی تھے

اور ان کے پاس صرف وہی ہتھیار تھے جو ایک مسافر اپنے ساتھ رکھتا ہے یعنی نیام میں تلواریں جب آپ ﷺ مقامِ عسفان کے قریب پہنچ گئے تو ایک مخبر نے آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ قریش نے آپ ﷺ کو مقابلہ اور پیش قدمی کو روکنے کے لیے احابیش (مختلف قبائل کے جنگجو افراد) کو اکٹھا کر رکھا ہے اور خاصی بڑی فوج منظّم کر لی ہے، ان کا ارادہ ہے کہ جنگ کر کے آپ ﷺ کو بیت اللہ تک پہنچنے سے باز رکھیں۔ [1] آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

افسوس ہے قریش کی عقل پر! جنگ نے ان کو کھا لیا۔ ان کا کیا بگڑے گا، اگر وہ مجھے سارے عربوں سے نمٹنے کے لیے چھوڑ دیں، اگر یہ لوگ مجھ پر غالب آ گئے تو ان کا منشا پورا ہو جائے گا اور اگر اللہ نے مجھے ان پر غالب کر دیا تو وہ سب اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور اگر ایسا نہ کریں گے تو جنگ کریں گے اور ان کے ساتھ طاقت ہو گی پھر آخر قریش کیا چاہتے ہیں؟ اللہ کی قسم! میں اس پیغام کی راہ میں جہاد کرتا رہوں گا یہاں تک کہ اللہ اسے غالب کر دے یا میرا سر تن سے جدا کر ہو جائے۔

جب آپ مقام حدیبیہ...... مکہ اور جدہ کے درمیان ایک جگہ ہے...... پہنچے تو قبیلہ خزاعہ کے بعض آدمیوں نے آپ سے اس آمد کی وجہ دریافت کی۔ آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ ہم جنگ کرنے کے لیے نہیں بلکہ عمرہ کا ارادہ کر کے یہاں آئے ہیں۔ چنانچہ وہ واپس لوٹ گئے اور مشرکینِ مکہ سے انہوں نے کہا کہ تم لوگ بلا وجہ جلد بازی مچائے ہوئے ہو محمد صلّی علیہ و سلّم جنگ کی نیت سے نہیں آئے۔ ان کا ارادہ محض زیارتِ بیت اللہ کا ہے۔ مشرکین نے کہا:

نہیں بخدا وہ بزور ہمارے پاس نہیں آ سکتے اور عرب اس سلسلہ میں ہم سے گفتگو نہ کریں۔

مشرکین نے عروہ بن مسعود ثقفی کو بھیجا کہ وہ رسول اللہ سے جا کر اس سلسلہ میں بات کریں چنانچہ وہ آ کر آپ ﷺ سے ملے اور گفتگو کی۔ قریش میں لوٹنے کے بعد انہوں نے وہ ساری کیفیت بیان کی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبتِ رسول ﷺ کے دل نواز مناظر کی شکل میں

[1] صحيح بخاری:٤١٧٨، صحيح ابی داؤد:٢٧٦٥۔

انہوں نے دیکھی تھی لیکن انہوں نے انکار کیا۔ ❶ پھر آپ ﷺ نے عثمان بن عفانؓ کو مکہ کے سرداروں کی خدمت میں بھیجا کہ وہ آپ ﷺ کی آمد کا مقصد بیان کریں۔ انہیں کچھ تاخیر ہوئی اور مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو بیعت کی دعوت دی تمام لوگوں نے جوش و وارفتگی کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیعت کی۔ آپ ﷺ نے اس پر بیعت لی کہ کوئی راہ فرار اختیار نہ کرے گا۔

جب قریش کو اس بیعت کا علم ہوا تو وہ ڈر گئے اور انہوں نے اس بات پر صلح چاہی کہ اس سال بغیر زیارت کے لوٹ جائیں اور اگلے سال زیارت کریں۔ تین دن تک قیام کریں گے ساتھ میں مسافر کا ہتھیار یعنی نیزے اور نیام میں تلواریں ہوں گی۔ قریش نے سہیل بن عمرو کو اس صلح کی تکمیل کے لیے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا اور آخر کار قریش کے حسبِ منشا اس بات پر صلح ہو گئی کہ دونوں فریقوں کے درمیان دس سال تک جنگ بندی رہے گی اور جو کوئی محمد ﷺ سے بھاگ کر مکہ آئے گا اسے واپس نہ کیا جائے گا۔ اور جو مکہ سے بھاگ کر محمد ﷺ کے پاس آئے گا اسے لوٹانا ہو گا۔ مسلمانوں کو معاہدہ کی یہ دفعہ سخت ناگوار لگی اور ان شرائط کے سلسلے میں وہ نبی ﷺ سے مباحثہ کرنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس معاملے میں پیش پیش تھے یہاں تک کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کا بندہ ہوں اور وہ مجھے برباد نہ کرے گا۔ پھر آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو احرام کھول دینے کا حکم دیا لیکن درد و کرب کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے کیونکہ انہیں مکہ جانے سے روک دیا گیا تھا اور صلح کی شرطیں انہیں سخت ناگوار محسوس ہوئی تھیں چنانچہ آپ ﷺ نے پیش قدمی کی، احرام کھول دیا اور پھر سارے مسلمانوں نے احرام کھول دیئے، بعد میں اس صلح کے فوائد ظاہر ہوئے جو مسلمانوں کو اس وقت سخت گراں گزار تھا، لیکن چونکہ آپ اللہ کے رسول تھے رائے اور عمل میں وحی الٰہی سے مشرف تھے، پختہ فکر اور بالغ نظر رکھتے تھے، اس لیے اس فیصلہ پر راضی اور مطمئن تھے۔

---

❶ صحيح ابنِ حبان : ٤٨٧٢ .

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو ''فتح مبین'' قرار دیا۔ فرمایا:

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿۳﴾﴾ (سورة الفتح : ۱ تا ۳)

''اے نبی (ﷺ)، ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تا کہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے اور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو زبردست نصرت بخشے۔''

پھر رسول اللہ کی بیعت پر یوں تبصرہ کیا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ

نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰي نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۰﴾﴾ (سورة الفتح : ۱۰)

''(اے نبی ﷺ!) جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا اور جو اُس عہد کی وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔''

بیعتِ رضوان کرنے والوں سے وہ خوش ہوا تو اس کا اظہار یوں کیا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾﴾

(سورة الفتح : ۱۸)

''اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے

تھے اُن کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی۔''

اور رسول اللہ ﷺ کے اس سچّے خواب کو بیان کیا جو صلح حدیبیہ کا سبب بنا:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝﴾ (سورة الفتح : ٢٧)

''فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ ان شاء اللہ تم ضرور مسجدِ حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے، اپنے سر منڈاؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمہیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ وہ اُس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔''

پھر اس کے معاً بعد اس دین کی اقامت اور اس کے غلبہ کی بات چھیڑ دی:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝﴾ (سورة الفتح : ٢٨)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولوں کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔''

(۷) غزوۂ خیبر

یہ غزوہ ۷ ھ میں لڑا گیا۔ خیبر ایک یہودی نو آبادی تھی جو شام کی طرف مدینہ کے شمال میں سو (۱۰۰) میل کی مسافت پر واقع تھی۔

اس کا محرّک یہ ہوا کہ قریش کی جانب سے صلح حدیبیہ کے بعد اطمینان حاصل ہو گیا تو مدینہ کے اندر سے یہودیوں کا صفایا کرنے کے بعد اطراف و جوانب میں ان کی سازشوں

سے نجات حاصل کرنے کی آپ ﷺ نے فکر کی۔ خیبر یہود کا جنگی مستقر تھا جس میں بڑے مستحکم قلعے تھے اور اس میں جنگجو رہتے تھے جو ہر قسم کے ہتھیاروں سے مسلّح تھے، یہ بڑے مکّار، غدّار اور کمینہ فطرت تھے، اس لیے ان کی سازشوں اور مکّاریوں سے نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔ اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے محرم کے آخر میں ان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور نو سو فوجیوں کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ کیا۔ جن میں دو سو شہ سوار تھے۔ آپ ﷺ نے اس کو اس میں شرکت کی اجازت نہ دی جو حدیبیہ کے موقع پر پیچھے رہا تھا جب آپ خیبر کے سامنے تشریف لے آئے تو آپ ﷺ نے اللہ سے دُعا فرمائی، فتح خیبر کا سوال کیا۔ اور اس جگہ کے شر سے اور یہاں کے لوگوں کے شر سے پناہ مانگی۔

جب لشکرِ اسلام پہنچ گیا تو آپ ﷺ نے ''حصنُ النطاق'' نامی ایک قلعہ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ جہاں یہودیوں نے اپنی فوج جمع کر رکھی تھی۔ حباب بن منذر نے دوسری جگہ پڑاؤ ڈالنے کا مشورہ دیا، کیونکہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ ان کے تیر انداز کافی ماہر اور نشانہ باز ہیں اور وہ بلندی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں پر تیر اندازی کریں گے اور یہ کہ رات میں چُھپ چُھپا کر مختلف قسم کی تدبیریں کر سکتے ہیں چنانچہ آپ ﷺ نے جگہ بدل دی اور یکے بعد دیگرے قلعے فتح ہوتے گئے۔ البتہ آخری دو قلعوں کے یہودیوں نے اس شرط پر صلح چاہی کہ ان کے شر پسند اور جنگجو افراد قتل کر دیئے جائیں، بچوں اور عورتوں کو چھوڑ دیا جائے اور خیبر کی سرزمین سے یہ نکل جائیں اور ساتھ میں صرف ایک کپڑا لے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہ سوچ کر مصالحت کر لی کہ اگر انہوں نے کچھ چھپایا اور مکر سے کام لیا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی امان ان سے اُٹھ جائے گی۔ چنانچہ جب یہود وہاں سے نکلے تو مسلمانوں کو بہت بڑی تعداد میں ہتھیار اور تورات کے متعدد صحیفے ہاتھ لگے۔ بعد میں یہودیوں نے تورات کے صحیفوں کو واپس لینا چاہا تو آپ ﷺ نے انہیں لوٹانے کا حکم دیا۔ اس غزوہ میں یہودی مقتولین کی تعداد ترانوے ۹۳ تھی جبکہ

مسلمان پندرہ کی تعداد میں شہید ہوئے۔

(۸) غزوۂ موتہ:

یہ غزوہ جمادی الاولیٰ ۸ھ میں پیش آیا۔ موتہ شرق اردن کے شہر کرک کے جنوب میں بارہ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اس غزوہ کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حارث بن عمیر الازدی رضی اللہ عنہ کو اپنے مکتوب عالی کے ساتھ بصریٰ کے حاکم شرجیل بن عمرو غسّانی کے پاس بھیجا جو رومی سلطنت کے تابع تھا۔ یہ ان مکتوبات میں سے ایک ہے ۔ جن میں امراء اور بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ جب قاصد اس حاکم کے پاس پہنچے تو اس نے سوال کیا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ شاید تم محمد ﷺ کے قاصد ہو؟! انہوں نے اثبات میں جواب دیا، چنانچہ اس نے انہیں شہید کرا دیا۔ آپ ﷺ کو اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو سخت کرب اور اذیت کا احساس ہوا، کیونکہ اس سے پہلے آپ ﷺ کے کسی قاصد کو قتل نہ کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے تین ہزار افراد پر مشتمل لشکر تیار کیا اور اس کا امیر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بنایا اور مسلمانوں کو وصیّت کی کہ اگر یہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو امارت سونپی جائے اور ان کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آئے تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا جائے اور زید رضی اللہ عنہ کو تاکید کی کہ پہلے اسلام کی دعوت دی جائے اگر وہ قبول کر لیں تو فبہا ورنہ اللہ کی مدد کے بھروسے پر ان سے جنگ کی جائے۔ مسلمانوں کو وصیت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو اور سارے مسلمانوں کو خیر اور بھلائی کی اور خوفِ الٰہی کی وصیّت کرتا ہوں۔ اللہ کا نام لے کر اس کی راہ میں جہاد کرو ان تمام لوگوں سے جو کافر ہیں اور دھوکہ نہ دو، خیانت نہ کرو، کسی بچے، عورت، کمزور بڈھے یا عبادت گاہوں میں لگے ہوئے راہبوں کو قتل نہ کرو، پھل دار درخت کو ہاتھ نہ لگاؤ، پیڑ پودوں کو نہ کاٹو، اور گھروں کو منہدم نہ کرو۔ پھر لشکر اللہ کی برکت کے سہارے روانہ ہوا خود رسول اللہ نے چل کر انہیں رخصت کیا۔ یہ لوگ سفر کرتے رہے یہاں تک کہ

مقام ''معان'' تک پہنچ گئے۔ یہاں انہیں اطلاع ملی کہ ہرقل ''بلقاء'' میں ایک لاکھ رومی فوج کے ہمراہ مقیم ہے اور اس کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں عرب قبائل بھی آ ملے ہیں۔ مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ یہ رائے ٹھہری کہ رسول اللہ ﷺ کو ساری صورتِ حال سے مطلع کیا جائے اور آپ ﷺ سے کمک طلب کی جائے یا مقابلہ کا حکم دیں تو اس کی تعمیل کی جائے۔ اس موقعہ پر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

اللہ کی قسم! آج تم اُس چیز کو ناگوار اور تلخ محسوس کر رہے ہو جس کے لیے تم نکلے تھے اور جو تمہاری دلی مراد تھی یعنی شہادت۔ ہم دُشمن کا مقابلہ تعداد اور قوت کی بنیاد پر نہیں کرتے ہم تو اس کا مقابلہ اس دین کی طاقت سے کرتے ہیں جس سے اللہ نے ہم کو سرفراز کیا ہے۔ یہاں دونوں ہی صورتوں میں ہمارا فائدہ ہے جیت ہو تب بھی اور شہادت ہو تب بھی اس تقریر کو سن کر لوگ معرکہ آرائی پر ان سے متفق ہو گئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ زید رضی اللہ عنہ نے جنگ کا آغاز کیا اور آخر کار شہید ہوئے، پھر جعفر رضی اللہ عنہ نے پرچم سنبھال لیا اور گھوڑے پر جنگ کرتے رہے، جب لڑائی کا دباؤ بڑھا تو گھوڑے سے اُتر گئے اور اس کی اگلی ٹانگیں کاٹ دیں اور پیادہ پا لڑنا شروع کیا اتنے میں ان کا داہنا بازو کٹ گیا، انہوں نے پرچم اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا اور بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا تو پرچم سینے سے جکڑ لیا یہاں تک کہ شہادت سے سُرخرو ہوئے ان کے سینے اور بازوؤں کے درمیان نوّے زخم تھے جو تلوار اور نیزہ کے تھے، کوئی زخم پشت کی طرف نہ تھا۔

پھر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے پرچم اپنے ہاتھ میں لیا اور دُشمنوں سے جنگ کی یہاں تک کہ جامِ شہادت نوش کیا۔ پھر لوگوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت پر اتفاق کر لیا اور یہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد پہلا معرکہ تھا جس میں وہ شریک ہوئے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنی سیاسی اور فوجی تدبیروں سے کام لیتے رہے یہاں تک کہ مسلمانوں کو بربادی اور تباہی کے چنگل سے نکال لیا اور مدینہ لوٹ آئے۔

یہ پہلا معرکہ تھا جو جزیرۂ عرب سے باہر روم کے خلاف برپا ہوا اور اس میں اگرچہ نبیٔ اکرم ﷺ خود شریک نہ تھے، لیکن جنگ آزماؤں کی کثرت کی وجہ سے اسے غزوۂ کا نام دیا گیا اس لیے کہ اس جنگ میں تین ہزار مسلمان شریک ہوئے جو عام سرایا اور دستوں سے بہت زیادہ تعداد میں تھے۔

اس معرکہ میں اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ''سیف اللہ''یعنی ''اللہ کی تلوار'' کا لقب عنایت فرمایا۔ [1]

(۹) فتح مکّہ:

یہ ۸ھ میں واقع ہوئی۔ اس غزوہ کا محرّک ایک واقعہ بنا۔ صلح حدیبیہ کی ایک دِفعہ یہ تھی کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے عہد و پناہ میں آنا چاہے وہ ایسا کرسکتا ہے اور جو شخص قریش کی پناہ اور عہدہ قبول کرنا چاہے وہ اس میں آزاد ہوگا چنانچہ بنو بکر نے قریش کو ترجیح دی اور بنوخزاعہ نے رسول اللہ ﷺ کی پشت پناہی اور حمایت پسند کی۔

۸ھ میں بنو بکر نے موقع غنیمت جان کر اپنے پُرانے دُشمنوں یعنی بنوخزاعہ کے افراد سے اپنا حساب بے باق کرنا چاہا اور بنوخزاعہ پر اس وقت شبخون مارا جبکہ وہ پانی کے ایک چشمہ کے پاس مقیم تھے، لڑائی ہوئی اور خزاعہ کے تقریباً بیس آدمی مارے گئے۔ قریش نے بنو بکر کی ہتھیاروں سے مدد کی اور رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھا کر قریش کے سردار اس جنگ میں شریک ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ یہ سن کر سخت برافروختہ ہوئے اور قریش سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، لیکن آپ ﷺ نے اسے خفیہ رکھا تا کہ قریش باخبر نہ ہو جائیں اور حرام مہینوں کو مبادا حلال کر بیٹھیں۔ لیکن حاطب بن ابن بلتعہ نے ایک خفیہ خط کے ذریعے قریش کو اس ارادہ سے باخبر کر دیا۔ اللہ نے فوراً اپنے رسول کو وحی کے ذریعے اس کی اطلاع

---

[1] الصحیح المسند للوادعی:۲۸۹، صحیح دلائل النبوّۃ؛۶۶۱، احکام الجنائز للالبانی:۶٤.

دی۔ چنانچہ چند افراد آپ ﷺ نے فوراً اُس عورت کی تلاش میں روانہ کیئے جو خط لے کر جا رہی تھی۔ خط کا پتہ لگ گیا اور اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو جواب میں عرض کیا:

اے اللہ کے رسول ﷺ! اللہ کی قسم! میں اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہوں، میں نے اپنا دین تبدیل کیا ہے نہ اپنی وفاداری، لیکن میرا قریش سے ویسا تعلق نہیں جیسا اُن مہاجرین کا ہے جن میں ان کی قرابتیں ہیں جو ان کے عزیزوں کے پشت پناہ بن سکتے ہیں میرے گھر کے بچے اور افراد وہیں ہیں چنانچہ میں نے یہ حرکت اس لیے کی تا کہ اس احسان کے بدلے میرے خاندان کے لوگوں کی حفاظت ہو سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا:

یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اجازت دیجئے، میں اسی وقت اس منافق کی گردن اُڑا دوں کہ اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''وہ بدر میں شریک تھے، اور عمر! تمہیں کیا معلوم کہ کہیں اہلِ بدر کو اللہ نے مخاطب کر کے فرما دیا ہو کہ جو تم چاہو کرو، میں نے تمہارے سب قصور معاف کر دیئے ہیں۔'' [1]

غرض رسول اللہ ﷺ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ یہ لشکر دس ہزار صحابہ پر مشتمل تھا۔ راستے میں آپ ﷺ نے اور تمام مسلمانوں نے سفر کی مشقتوں کی وجہ سے روزہ توڑ دیا۔ راستے میں دوسرے قبائل لشکرِ اسلام میں ملتے گئے۔ ''مرّ الظہران'' میں چچا زاد بھائی ابوسفیان ملے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ترغیب پر مسلمان ہو گئے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ ایسا شخص ہے جو فخر کو محبوب رکھتا ہے، آپ ﷺ اسے کوئی ایسی

---

[1] بخاری: ٤٨٩٠، ٦٢٥٩؛ صحیح ابی داؤد: ٢٦٥١٢، صحیح الموارد الظمان للالبانی: ١٨٦٧، صحیح الآداب المفرد للالبانی: ٣٣٩، صحیح الترمذی: ٣٨٦٤، مسند الفاروق لابن کثیر: ٢/ ٤٧١، الصحیح المسند للوادعی: ٧٠٩، ١١١٢، المطالب لاعالیه لابن حجر؛ ٤/ ١٧٣، الاصابة ١/ ٣٠٠، مسند احمد: ٢/ ٢٤٦

چیز دے دیں جس پر وہ فخر کر سکے، چنانچہ آپ ﷺ نے منادی کرادی کہ جو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کو پناہ ملے گی اور اس عام معافی سے پندرہ آدمیوں کو مستثنیٰ کر دیا جن کا جرم سب سے زیادہ قبیح و شنیع اور بدترین تھا۔ پھر آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے عبدیت کے غلبہ سے سواری پر آپ ﷺ کی گردن جُھکی جا رہی تھی قریب تھا کہ ٹھوڑی اونٹنی کے کجاوے سے لگ جائے۔ آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے وقت سورۂ فتح پڑھ رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے بیت اللہ کا طواف کیا اور تین سو ساٹھ بت جو یہاں طاغوتیت و خدائی کر رہے تھے پاش پاش کر دیئے۔ پھر کعبہ میں داخل ہوئے اور دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور اہلِ قریش کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا:

''تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ لوگ پکار اُٹھے: ہم اچھی اُمید رکھتے ہیں، آپ ﷺ کریم النفس ہیں اور شریف بھائی ہیں اور کریم وشریف بھائی کے بیٹے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

''مَیں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا:

((﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ (سورۃ یوسف: ۹۲) اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ))

''آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

مکہ میں ایک جگہ مجمع آپ ﷺ سے اسلام پر بیعت کرنے کے لیے اکٹھا ہوگیا۔ آپ ﷺ ان سے بیعت لینے کے لیے کوہِ صفا پر تشریف لائے اور وہاں بیٹھ کر ان سے اللہ و رسول ﷺ کی سمع وطاعت پر بیعت لی۔ مردوں کے بعد عورتوں سے بیعت لی اور ان میں سے کسی سے ہاتھ نہ ملایا۔ ان میں ہند بنت عتبہ بھی تھی فتحِ مکہ کے دن جس کا خون آپ ﷺ نے مباح کر دیا تھا، وہ اسلام لے آئی تو آپ ﷺ نے اسے معاف کر دیا۔ بیعت لے لی۔

اس دن اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر نمازِ ظہر کے لیے اذان دے دیں۔

قریش کے سب سرداران اور اشراف نے یہ اذان سنی اور وادئ مکہ اس آواز سے گونج اٹھی۔

(۱۰)غزوۂ حنین:

دس شوال ۸ھ کو یہ معرکہ پیش آیا۔اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب مکہ فتح ہوگیا تو قبیلۂ ہوازن اور قبیلہ بنی ثقیف نے سمجھ لیا کہ اب باری آ گئی ہے چنانچہ انہوں نے جنگ شروع کرنے کا فیصلہ کردیا۔قبیلہ کا سردار مالک بن عوف کو بنایا جو تیس سال کا جوان تھا اس نے حکم دیا کہ مال ومتاع ،عورتیں اور بچے ساتھ میں رکھے جائیں تا کہ گھر والوں کی عزت وناموس کے خیال سے وہ پامردی سے مقابلہ کریں اور راہ فرار اختیار نہ کرسکیں ۔اس غزوہ میں ان کے جنگجوؤں کی تعداد بیس سے تیس ہزار تھی ۔چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے جنگ کے لیے نکلنے کا اعلان کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فدائیان اسلام کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جو ابھی نئے نئے اسلام لائے تھے۔ آپ ﷺ جب وادئ حنین میں پہنچے تو صبح کے دھندلکے میں نشیب کی طرف ہوازن اور ان کے حلیفوں نے اترنا شروع کیا اور ان پر مسلمانوں نے حملہ کر دیا اور دشمن سمٹنے لگے اور شکست کھا کر پیچھے ہٹنے لگے۔مسلمان مالِ غنیمت کوسمیٹنے میں لگ گئے اور دشمنوں نے انہیں پلٹ کر اپنے تیروں پر رکھ لیا اور تلواریں بے نیام کرلیں ۔اکثر مسلمان اس اچانک حملے سے گھبرا کر پیچھے کی طرف پلٹے ۔کوئی کسی کو دیکھتا نہ تھا کہ کہاں ہے اور اہلِ مکہ اور نئے مسلمان پیچھے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے،لیکن اللہ کے رسول ﷺ اپنی سواری پر انتہائی شجاعت و پاکدامنی سے کھڑے اعلان کرتے جاتے تھے۔

اَنَــــا الـــنَّبِــیُّ لَا کَــذِبَ اَنَـــا ابْـنُ عَبْـدِالْـمُـطَّلِـبِ
میں پیغمبرِ صادق ہوں میں فرزندِ عبدالمطلب ہوں

مسلمانوں میں یہ افواہ عام ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہوگئے ۔بہت سے لوگوں نے مایوس ہوکر ہتھیار پھینک دیئے لیکن انصار ومہاجرین کی ایک جماعت اپنے موقف پر جمی رہی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بآواز بلند پکارنے لگے کہ اللہ کے رسول ﷺ حیات ہیں ۔جب ان کی

آواز کسی آدمی تک پہنچتی تو اسی وقت اس کے قدم رک جاتے اور وہ اپنی تلوار اور ڈھال لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہو جاتا۔ پھر تو مقابلہ کرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ایک بار پھر فتح اور غلبہ کی پوزیشن میں ہو گئے اور مسلمان دشمنوں کو قید و قتل کرنے لگے، دشمنوں سے چھینا ہوا مالِ غنیمت بے حد وحساب تھا۔ آپ ﷺ نے تالیفِ قلب کے لیے نئے مسلمان ہونے والوں کو زیادہ حصہ دیا اور انصار کے ایمان و اسلام اور ان کی راست بازی اور اخلاص پر اعتماد کرتے ہوئے انہیں کچھ نہ دیا۔ قرآن میں اس جنگ پر یوں تبصرہ کیا گیا:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾﴾

(سورة التوبة: ۲۵تا۲۶)

”اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز (اُس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اُس روز تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرور تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرینِ حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے اُن لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔“

اسلام اور مشرکوں کے مابین یہ آخری فیصلہ کُن معرکہ تھا، اس کے بعد عرب اپنے بت توڑ کر اسلام کے ”دامن میں پناہ گزیں“ ہو گئے۔ [1]

---

[1] یہاں پر ہم نے لفظ ”حلقہ بگوش“ بدل کر ”دامن میں پناہ گزیں“ کر دیا ہے۔ جبکہ حلقہ بگوش معروف جملہ ہے لیکن یہ غیر مسلموں یا صوفیوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ (ابوعدنان)

(۱۱) غزوۂ تبوک:

یہ غزوہ رجب ۹ھ میں پیش ہوا۔ اسے غزوہ عسرت (تنگی کی جنگ) بھی کہا جاتا ہے۔ تبوک مدینہ منورہ اور دمشق کے درمیان نصف فاصلہ پر واقع ہے۔ اس جنگ کا محرک یہ ہوا کہ نبطیوں سے رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر ملی کہ ہرقل نے لخم، جزام، عاملہ، غسّان اور عرب کے دیگر قبائل کے ساتھ شام میں ایک بڑی فوج جمع کر رکھی ہے اور ان کے دستے ''بلقا'' تک پہنچ بھی چکے تھے۔ ہرقل کا مقصد مدینہ کی اسلامی ریاست پر حملہ کرنا اور اس اُبھرتی ہوئی سلطنت کو دبا دینا تھا۔ چنانچہ اللہ رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جنگ کے لیے نکلنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ وقت سخت گرمی کا تھا اور عسرت اور قحط سالی درپیش تھی۔ مؤمنین صادقین پوری آمادگی اور تیاری کے ساتھ اس میں لگ گئے، البتہ تین مخلص اہلِ ایمان پیچھے رہ گئے۔ آپ ﷺ نے اہلِ ثروت افراد کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی، چنانچہ دولت مند طبقہ کے بہت سے افراد سامنے آئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنا پورا مال لے کر حاضر ہوگئے جو چالیس ہزار درہم تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نصف مال لے کر آئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مالِ کثیر اس دن خرچ کیا اور پورے لشکر کے تہائی حصّہ کا سامان فراہم کرنے کا ذمہ لیا، یہاں تک کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے حق میں دعاء فرمائی کہ آج کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ جو کچھ کریں انہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو استطاعت نہ رکھتے تھے، رسول اللہ ﷺ سے سواری کی درخواست کی آپ ﷺ نے اس کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ان سے معذرت کر دی، چنانچہ وہ لوٹ آئے اس غم کے ساتھ کہ ان کے پاس خرچ موجود نہ تھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ [1]

---

[1] ملاحظہ ہو سورۃ التوبہ، آیت: ۹۱، ۹۲۔

﴿ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ﴿۹۱﴾ وَّ لَا عَلَى الَّذِيْنَ ⇦

منافقین اس موقع پر مختلف بہانے اور عذر کر کے بیٹھ رہے۔ اور بہت سے بدوؤں نے غیر معقول بہانے کیئے اور آپ ﷺ نے انہیں قبول کر لیا۔ آپ ﷺ تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے تبوک کے لیے روانہ ہوئے۔ دس ہزار گھوڑے تھے۔ اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد عربوں نے دیکھی نہ تھی۔ آپ ﷺ مسلسل سفر کرتے رہے یہاں تک کہ تبوک پہنچ گئے تقریباً بیس دن وہاں قیام کیا، لیکن کسی جنگ اور فوج جا منظر دیکھنے میں نہ آیا۔

یہ آخری غزوہ تھا جو آپ ﷺ کے زمانے میں ہوا۔ اس غزوہ پر اس طرح اللہ تعالیٰ نے تبصرہ کیا۔

﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ ﴾

(سورة التوبه : ۱۱۷ ، ۱۱۸)

”اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے

⇐⇐ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ ﴾

ترجمہ: ”نہ تو ضعیفوں پر کچھ گناہ ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جن کے پاس خرچ موجود نہیں (کہ شریکِ جہاد نہ ہوں یعنی) جبکہ اللہ اور اس کے رسول کے خیر اندیش (اور دل سے ان کے ساتھ) ہوں نیکوکاروں پر کسی طرح کا ارزام نہیں ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر (الزام) ہے کہ تمہارے پاس ي ئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس پر تمہیں سوار کروں تو وہ لوٹ گئے اور اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ موجود نہ تھا ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔“

وقت میں نبی کا ساتھ دیا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبی ﷺ کا ساتھ دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ بیشک اس کا معاملہ اِن لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے اور اُن تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملہ کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور اُن کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامنِ رحمت کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا رحیم ہے۔''

بکثرت آیات میں منافقین اور بدوؤں پر تنقید کی گئی اور ان کی معذرت قبول کرنے پر رسول ﷺ پر عتاب نازل کیا گیا۔ یہ ساری آیات سورۂ توبہ میں موجود ہیں۔ [1]

اسلام میں جنگ کا جواز - اسباب - مقاصد

ابتداء میں ہم اسلام میں جنگ کے جواز، اس کے اسباب اور عام قواعد و اصول پر گفتگو کریں گے:

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی دعوت کی تبلیغ و اشاعت حکمت و موعظتِ حسنہ کے ساتھ شروع کی۔ اللہ کی جانب سے نازل شدہ کتابِ الٰہی کے احکام انہیں پڑھ کر سناتے رہے اور اپنے عقل و قلب سے ان کے سامنے ایسی گفتگوئیں کرتے رہے جن سے اُن کی بت پرستی، خرافات و اوہام اور ضلالت و گمراہی کا پردہ چاک ہو سکے، لیکن قوم نے پہلے تو استہزا و اعراض سے کام لیا پھر ایذء و تعذیب اور افترا پردازی میں لگ گئی اور آخر میں آپ ﷺ کو قتل کرنے

---

[1] خصوصاً دیکھیے آیت: ۳۷ تا ۸۷، ۹۰، ۹۳ تا ۹۸، ۱۰۱، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۲۵ تا ۱۲۷۔

کی سازش بھی کرنے لگی یہاں تک کہ اللہ نے دعوت کا ایک محفوظ و مامون جدید مستقر عطا کر دیا۔ لیکن اس نئی جگہ پر بھی آپ ﷺ کو ہمیشہ دو قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف قریش تھے جو نبی اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہجرت کر جانے کی وجہ سے حسد اور غصّے سے کھول رہے تھے، اور دوسری طرف یہود تھے جن سے نبیٔ اکرم نے آغازِ قیامِ سلطنت ہی میں صلح و آشتی کی کوشش کی تھی، لیکن یہودی فطرتاً مکّار، دغاباز اور چالباز ہوتے ہیں۔ چنانچہ نبیٔ اکرم ﷺ جوں ہی مدینہ میں قیام پذیر ہوئے اور مہاجرین و انصار کی قیادت آپ ﷺ کے ہاتھ میں آئی، یہودی لیڈران اس نئی قیادت کے خلاف حسد اور غیض و غضب سے لال بھبھوکا ہو گئے، کیونکہ اب ان کی چودھراہٹ ختم ہو رہی تھی اور پورے مدینہ پر نبیٔ اکرم کا سکہ رائج ہونے والا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی مکہ میں مدّتِ قیام کے دوران ایسی آیات نازل ہوتی رہیں جن میں منکرین کے اعتراضات والزامات پر صبر و رضا کی روش اختیار کرنے کی تلقین کی گئی:

﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝۱۰﴾

(سورة المزمل : ١٠)

''اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔''

جب بھی صبر و ضبط کی آیات نازل ہوتیں، مشرکین کی اذیت رسانی اور ایذاء دہی میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ ایک سے ایک تدبیریں، چال اور ہتھیار استعمال کرتے۔ اس وقت قلّت و کمزوری کی وجہ سے مسلمان اپنا دفاع کرنے پر قادر نہ تھے، لیکن جب نبی ﷺ نے مدینہ کو اپنا جدید مُستقر بنا لیا اور مسلمانوں کو قوت و شوکت حاصل ہو گئی تو قریش نے ان کے خلاف سازشیں شروع کیں اور یہودی ہر ممکنہ خطرے کو روکنے کے لیے خفیہ تدبیریں اور سازشیں کرنے لگے۔ اسلام امرِ واقعہ کو تسلیم کرنے والا دین ہے وہ واقعات سے چشم پوشی نہیں کرتا نہ ایسی قوم کے سامنے خیالاتِ بلند اور اقدارِ برتر کی بات کرتا ہے جو ان پر ایمان نہیں رکھتی نہ ان

کا احترام کرتی ہے۔ ضروری تھا کہ وہ قوت و طاقت استعمال کرے اور ظلم و عدوان کو روکنے کے لیے تیار ہو جائے، اور باطل کی قوت و شوکت کا کام تمام کردے تاکہ اس کی دعوت کے راستے کھل جائیں، وہ عقول کو مخاطب کر سکے، نفوس کا تزکیہ کر سکے، فساد و فتنہ کو دور کر سکے، خیر کے لیے قندیلِ راہنمائی فراہم کر سکے جس سے لوگ راہ پا سکیں اور خیر و رُشد اور ہدایت و اصلاح کی زندگی بسر کر سکیں۔ اِنہی تمام اسباب کی وجہ سے ۲ھ میں اللہ نے جنگ کو جائز کہا:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝﴾ (سورۃ الحج:۳۹ تا ۴۱)

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ''ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجے اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں، اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

یہ اوّلین آیات ہیں جو جنگ کی اجازت کے سلسلے میں نازل ہوئیں۔ بہتر ہوگا کہ ان پر ذرا غور کرلیں تا کہ جنگ کی اجازت کی حکمت، اس کے فائدے اور مقاصد سمجھ سکیں:

(۱)...... آیت کے آغاز میں کہا گیا کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی صفت اَلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ (جن سے جنگ کی جارہی ہے) بھی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ جن مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے ان کے خلاف معرکہ برپا تھا۔ انہیں ستایا جارہا تھا اور ہر قسم کی تعذیب و ایذا ہی سے دوچار کیا جارہا تھا۔ چنانچہ انہیں اپنا دفاع کرنے، ظلم و استیصال کا مقابلہ کرنے اور ''جیسی کرنی ویسی کرنی بھرنی'' کا مصداق بنانے کی اجازت دے دی گئی جیسا کہ قرآن خود کہتا ہے:

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾

(سورة البقره : ۱۹٤)

''جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اُس پر دست درازی کرو۔''

﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (سورة الشورىٰ : ٤٠)

''برائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے۔''

(۲)...... اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جنگ لڑی گئی وہ ظلم و عدوان کے خلاف تھی۔ مسلمان جو ستائے جارہے تھے وہ ظلم تھا۔ مکہ میں وہ ظالم نہیں تھے بلکہ عقیدہ کا دفاع کررہے تھے اور قوم کو اوہام و خرافات سے نکلنے اور بُرے اخلاق سے آزاد ہونے کی دعوت دے رہے تھے۔

(۳)...... دوسری آیت میں ان تاریخی واقعات کا ذکر ہے جن میں یہ ظلم ہو رہا تھا۔ وہ یہ کہ مسلمان جنہیں جنگ کی اجازت دی گئی، اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے تھے اور اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ انسان کو اس کے وطن سے نکال دیا جائے اور اِدھر اُدھر بھٹکتے رہنے کے لیے ملک بدر کردیا جائے۔

(۴)...... اسی آیت میں مسلمانوں کے اخراج کیئے جانے کی وجہ بھی موجود ہے۔

انہوں نے بت پرستی اور باطل معبودوں کی عبادت کرنے میں اپنی قوم کی مخالفت کی اور اللہ واحد کی عبادت کی۔ یہ لوگ عقیدہ کی وجہ سے ستائے جا رہے تھے۔قریش انہیں آزادی نام کی کوئی چیز دینے کو تیار نہ تھے۔

(۵)...... چونکہ مسلمان عقیدہ کی آزادی سے محروم تھے اس لیے جس جنگ کی اجازت دی گئی وہ اس آزادی کی حفاظت کے لیے تھی جو انسان کی سب سے قابلِ فخر قدر ہے۔

(٦)...... پھر اللہ نے بتایا کہ جنگ کی اجازت کا فائدہ اتنا ہی نہیں ہے کہ ان کی دینی و مذہبی آزادی محفوظ ہو جائے گی بلکہ اس سے دوسرے مذاہب کے پیروکار بھی فائدہ اٹھا سکیں گے، یہودیت اور عیسائیت کو بھی اس سے برگ و بار پانے کا موقع ملے گا کیونکہ مسلمان جن مشرکین سے نبرد آزما تھے ،ان کا کوئی دین نہ تھا۔مسلمانوں کو جب طاقت مل جائے گی تو مسجدوں کی حفاظت کے ساتھ یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی وہ کریں گے تاکہ بت پرست اور ملحدین زور نہ پکڑ سکیں اور دوسرے مذاہب سے جنگ آزمانہ ہوں اور ان کی عبادت گاہوں پر تالے نہ لگا سکیں یہ اس آیت سے بالکل واضح ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا﴾ (سورة الحج : ٤٠)

’’اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجے اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں۔‘‘

اس آیت سے پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جنگ اس لیے نہیں لڑی جاتی تاکہ دوسرے آسمانی مذاہب کو مٹا دیا جائے اور ان کی عبادت گاہیں مسمار کر دی جائیں۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان مذاہب پر ملحدین اور بت پرستوں کا غلبہ نہ ہو سکے اور وہ ان کی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں سے محفوظ رہ سکیں۔

(۷)......تیسری آیت میں اس جنگ کے مقاصد اور اس سے مُرتب ہونے والے نتائج و فوائد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں قومی فتح ہوتی ہے نہ نو آبادیات کا نظام قیام پاتا ہے، مفتوحین کی دولت سمیٹنا مقصود ہوتا ہے نہ ان کی عزّت وشرف کو پامال کرنا مطمحِ نظر ہوتا ہے بلکہ اس کے نتائج انسانیت کے مفاد میں اور تمام معاشروں کے حق میں مفید ہوتے ہیں۔

الف:......عبادت کے ذریعے پورے عالم میں روحانی ارتقاء اور غیر مادی نشوونما ہوتا ہے۔

ب:......زکوٰۃ کے ذریعے قوموں میں عدلِ اجتماعی کی اشاعت ہوتی ہے۔

ج:......امر بالمعروف کے ذریعے معاشرے میں خیرونیکی میں تعاون کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

د:......نہی عن المنکر کے فریضہ کے ذریعے فتنہ وفساد، بُرائی اور جرائم کے استیصال میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہیں وہ نتائج جو مسلمانوں کے غلبہ وتمکّن سے رُونما ہوتے ہیں۔ ایک اسلامی سلطنت کا قیام عمل میں آتا ہے جو رُوح کی بلندی و برتری کے لیے کام کرتی ہے۔ معاشرے میں تعاون کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور خیر کے راستوں کو وا کر کے اور بُرائی کے راستوں کو بند کر کے انسانیت کو ارتقاء کی منزلوں پر لے جاتی ہے۔ بھلا اس مقصد سے عظیم اور پاکیزہ مقصد اور کون ہوسکتا ہے جس کی خاطر اسلام نے جنگ کی اجازت دی ہے؟ اور قدیم و جدید کی تمام قومیں کون سی ایسی جنگ سے آشنا ہیں جو تمام انسانوں کے لیے اس درجہ مفید ہو معاشرے کی بنیاد اس کے ارتقاء اور مکمل انسانی انقلاب پر رکھے جس میں انارکی واباحیت، انتشار و لاقانونیت، الحاد و لادینیت، قتل وخوں ریزی اور جنگوں کو وہ استعمال کرتا ہو جیسا کہ تہذیبِ جدید کے سائے میں یہ سب کچھ ہورہا ہے؟

جنگ کے اسلامی مقصد کو جان لینے کے بعد ہی ''جہاد فی سبیل اللہ''، کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد اس بات کا نام ہے کہ معاشرے میں نیکی وتقویٰ، عدل و انصاف اور امن و آشتی کے قیام کے لیے جدوجہد کی جائے ''فی سبیل اللہ'' سے مراد اللہ کا راستہ ہے اور یہ راستہ خیرونیکی، برّ وتقویٰ میں تعاون ومحبت سے ہو کر جاتا ہے۔ اس میں ظلم وعدوان کی کوئی منزل ہے ہی نہیں۔

عبرت و نصیحت

یہ سابقہ چند مختصر کلمات ہیں جو اسلام میں جنگ کے جواز پر تحریر کیئے گئے ہیں۔ اب ہم عہدِ رسالت کی جنگوں کے عبرت آموز پہلو اور لائقِ درس نکات پر گفتگو کریں گے۔ میری تو خواہش تھی کہ جنگوں پر علیحدہ سے گفتگو کی جائے لیکن وقت کم ہے اور اس کے لیے سینکڑوں صفحات درکار ہیں اس لیے ان تمام نکات کو بیک دفعہ تحریر کر رہا ہوں۔ کوشش کی ہے کہ ہر معرکہ سے متعدد پہلو نکل آئیں۔ ہوسکتا ہے کہ اگلے سال ہر جنگ پر الگ الگ گفتگو کرنے کا مجھے موقعہ مل جائے اگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال رہی، مدّت عمر نے وفا کی اور مرض میں کمی رہی تو ان شاء اللہ یہ ضرور ہوگا۔

(۱)...... بدر کفر و اسلام کے مابین پہلی جنگ تھی۔ نبیٔ اکرم ﷺ شام سے مکہ کو لوٹنے والے ایک تجارتی قافلے کو روکنے کے لیے نکلے تھے، لیکن قافلہ بچ کر نکل گیا اور مشرکین نے جنگ کا قطعی ارادہ کرلیا اور اس کے نتیجے میں یہ جنگ واقع ہوئی۔ اس قافلے کو روکنے کا مقصد ڈاکہ ڈالنا اور مال چھیننا نہ تھا جیسا کہ بعض افترا پرداز مستشرقین نے الزام لگایا ہے بلکہ اس کا محرک قریش سے انتقام لینا تھا اور انہوں نے ہجرت کے وقت مہاجرین کے جو مال ہتھیا لیے تھے اس کا تدارک کرنا تھا۔ بہتیرے مہاجرین کو قریش نے گھر بار، آراضی اور جائیداد چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور جس شخص کے بارے میں معلوم ہو گیا کہ وہ مکّہ سے ہجرت کر گیا ہے، اس کا گھر بیچ دیا گیا اور اس کی جائیداد پر قبضہ کرلیا گیا ہے۔ آج کا بین الاقوامی قانون مثلاً بمثل (PRINCIPLE OF RECIPROCITY) کے اصول پر عمل پیرا ہے، چنانچہ یہی

پالیسی اس وقت بھی اپنائی گئی۔ یہاں ایک تو یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس سے پہلے سات بار قریش کے قافلے کو چھیڑنے کی کوششیں ہو چکی تھیں اور ان تمام دستوں میں صرف مہاجرین ہوتے تھے ان میں کوئی ایک انصاری بھی شامل نہ تھا اس لیے کہ اگر مہاجرین قریش کے تجارتی قافلے کو روکتے تھے اور اموال و جائیداد پر قبضہ کر لیتے تھے تو تمام آسمانی اور انسانی قوانین کے مطابق یہ ان کا جائز اور قانونی حق تھا۔ یہ سات کوششیں یہ تھیں:

ہجرت کے بعد(۱)...... ساتویں مہینے کے آغاز میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھیجنا، (۲)...... آٹھویں مہینے کے شروع میں عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کا سریہ، (۳)......نویں مہینہ کے آغاز میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا سریہ، (۴)...... بارھویں مہینے میں ''غزوۂ ودان''، (۵)......تیرھویں مہینے میں ''غزوہ بواط یا ابوا''، (۶)...... اسی ماہ میں غزوۂ بدر اور سولھویں مہینے کے شروع میں ''غزوۂ عشیرہ'' یہ سارے سرایا اور چھاپے صرف مہاجرین پر مشتمل تھے، ان میں کوئی انصاری شامل نہ تھا۔ اس حقیقت سے ہماری بات کی تائید ہوتی ہے۔

(۲)......جنگوں میں فتح کثرتِ تعداد اور کثرتِ آلات و ہتھیار سے نہیں ہوتی بلکہ لشکر میں موجود معنوی قوت سے ہوتی ہے ۔ اسلامی فوج صاف ستھرا عقیدہ، روشن ایمان، شوقِ شہادت، ثوابِ الٰہی اور جنّتِ اُخروی کی رغبت سے سرشار تھی، اسی طرح فتنہ وفساد، کفر وفسق اور ضلالت وظلمت سے نجات پانے کی خوشی بھی ان پر حاوی تھی جبکہ مشرکین کی فوج بد عقیدگی، اخلاقی انارکی، اجتماعی انتشار، لذات میں انہماک، موروثی اوہام وخرافات کی اندھی تقلید اور جھوٹے معبودوں کی بندگی کی نمائندگی کر رہی تھی۔

دیکھیۓ جنگ شروع ہونے سے پہلے دونوں فوجیں کیا روش اختیار کرتی ہیں۔غزوۂ بدر کے آغاز سے پہلے مشرکین چاہتے تھے کہ تین دن تک قیام کرنے کا موقعہ مل جائے تا کہ جام و کباب کا لطف اُٹھا سکیں،نغمہ ورقص سے فیض حاصل کرسکیں،دفیں بجائی جائیں اور آگ خوب روشن کی جائے تا کہ پورے عرب کو خوف زدہ کرسکیں وہ ان چیزوں کو نصرت اور فتح کی

ضمانت اور اس کا راستہ سمجھتے تھے، جبکہ مسلمان جنگ کے آغاز سے پہلے اللہ سے لو لگائے ہوئے تھے، اسی سے نصرت کی دُعا کر رہے تھے، شہادت کی آرزو پال رہے تھے جنت کی خوشبو محسوس کر رہے تھے اور رسول ﷺ سجدے میں پڑے اللہ کے حضور گڑگڑا رہے تھے کہ آج مؤمن بندوں کو فتح سے نوازے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مُتقی اور فرماں بردار لوگ فتح یاب ہوئے اور لہو ولعب میں مست فوج شکست کھا گئی۔

جو شخص مسلم فوج اور مشرک فوج کی تعداد کا موازنہ کرے گا وہ دیکھے گا کہ ہر معرکہ میں مشرکین مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود فتح اِنہی کو نصیب ہوئی، یہاں تک کہ اُحد اور حنین کے معرکوں میں بھی آخری میدان مسلمانوں ہی کے ہاتھ رہا اور اگر مسلمانوں نے ان معرکوں میں غلطی نہ کی ہوتی اور اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی نہ کی ہوتی تو کبھی شکست سے دوچار نہ ہوتے۔

(۳)...... فوج کے سپاہیوں میں عزم وحوصلہ ہو اور جنگ لڑنے کا دم خم ہو اور دشمنوں سے مڈبھیڑ کی خوشی ہو تو کمانڈر انچیف اپنی پالیسی وپروگرام بروئے کار لانے میں فرحت محسوس کرتا ہے اور اسے کامیابی اور فتح پر بھرپور اعتماد ہوتا ہے جیسا کہ غزوۂ بدر میں ہوا۔

(۴)...... یہ کمانڈر انچیف کی ذمّہ داری ہے کہ اپنی فوج کو جنگ لڑنے پر مجبور نہ کرے، اگر اس میں اسکی خواہش اور رغبت نہ ہو تا آنکہ وہ خود جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کرے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے غزوۂ بدر کے موقع پر میدانِ کارزار میں کودنے سے پہلے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا تھا

(۵)...... کمانڈر کی زندگی کے لیے فوجیوں کا محتاط و دور اندیش رہنا، جنگ ودعوت کے میدانوں میں کامیابی کی رغبت کا قطعی اعلان ہے اور کمانڈر کو اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیئے کیونکہ اس کی زندگی ہی دعوت کی زندگی ہے اور اس کی موت جنگ مین خسارہ کا باعث ہوسکتی ہے۔

ہم نے غزوۂ بدر میں دیکھا کہ کس طرح اللہ کے رسول ﷺ جھونپڑی کی تعمیر پر راضی ہوگئے اور غزوۂ اُحد اور حنین میں کس طرح سچے مسلمان مرد تو درکنار، عورتیں بھی اپنے رسول ﷺ کے گرد حِصار بنائے کھڑی رہتی تھیں، دشمنوں کے تیروں کو اپنے جسموں پر روکتی تھیں اور یہ بات معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی شجاعت اور تائیدِ ربانی کے باوجود اس پر کبھی اظہار نکیر نہ کیا بلکہ اپنے اردگرا کٹھے ہونے والوں کی تعریف کی اور ان کے حق میں دعا کی کہ وہ، ان کے شوہر اور بچے جنت میں آپ ﷺ کے رفیق بنیں۔

(۶)...... اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے مومن بندوں کی حفاظت اپنی فوج بھیج کر کرتا ہے جیسا کہ اس نے غزوۂ بدر میں فرشتے بھیجے اور غزوۂ احزاب میں سخت آندھی چلا دی۔ اور جب تک مسلمان اس کی راہ میں جہاد کرتے رہیں گے وہ انہیں کیسے یکّہ و تنہا چھوڑ سکتا ہے جبکہ اس نے خود کہا ہے:

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (سورۃ الروم: ٤٧)

''اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔''

﴿إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (سورۃ الحج: ٣٨)

''یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں۔''

(۷)...... ایک سچا اور مخلص داعی طبعی طور پر اپنے دشمنوں کی ہدایت کا حریص ہوتا ہے۔ وہ اس بات کا شدید خواہش مند ہوتا ہے کہ ان کے سامنے پوری بات کھول کر رکھ دے شاید کہ اللہ ان کے دلوں میں ہدایت ڈال دے۔ یہاں سے ہمیں غزوۂ بدر کے قیدیوں کو زرِ فدیہ کے عوض چھوڑ دینے کی حکمت معلوم ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کو توقع تھی کہ اللہ انہیں ہدایت دے دے گا اور ان کے بعد ان کی نسل عبادتِ الٰہی اور دعوتِ اسلام کی علمبردار ہوگی۔ قرآن نے اس پر جو ملامت کی ہے اس میں ایک دوسری مصلحت ہے، وہ یہ کہ دشمنانِ دین کو خوف زدہ کر دیا جائے اور فتنہ و ضلالت کا قلع قمع کر دیا جائے۔ اگر غزوۂ بدر کے قیدیوں کو قتل کر دیا

گیا ہوتا تو لیڈرانِ قوم کا صفایا ہو جانے کی وجہ سے ان کی مخالفت ومزاحمت سرد پڑ جاتی اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکانے والے نہ رہتے۔

(۸)......دُور اندیش اور بابصیرت قائد کی نافرمانی خسارہ اور نقصان وشکست کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ غزوۂ اُحد میں ہوا۔ وہ تیر انداز جنہیں اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی فوج کے پیچھے متعین کیا تھا، اگر رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں آخر وقت تک ثابت قدم رہتے تو مشرکین کو پلٹ کر حملہ کرنے کی جرات نہ ہوتی اور یہ شاندار فتح شکست میں تبدیل نہ ہوتی، یہی وجہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو دھمکی دی ہے کہ وہ حکمِ رسول ﷺ کی مخالفت کریں گے تو عذاب سے دوچار ہوں گے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝﴾ (سورة النور:٦٣)

''رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیئے کہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے۔''

(۹)...... مالِ غنیمت وغیرہ کا مادّی لالچ، بزدلی اور پھر شکست پر منتج ہوتا ہے۔ جیسا کہ غزوۂ اُحد میں اس وقت شکست ہوئی جب تیراندازوں نے مالِ غنیمت کے لالچ میں اپنا محاذ چھوڑ دیا۔ اور جیسا کہ غزوۂ حنین میں آغاز میں مسلمانوں کو فتح ہوئی پھر بعض لوگوں نے مالِ غنیمت کے لالچ میں دشمنوں کا تعاقب چھوڑ دیا جس کی وجہ سے وہ دوبارہ اپنی قوت مجتمع کر کے پلٹے اور مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کیا۔ اور اگر اللہ کے رسول ﷺ اور سچے صحابہ رضی اللہ عنہم ثابت قدم نہ رہتے تو یہ شکست فتحِ مبین میں کبھی تبدیل نہ ہو سکتی تھی۔ یہی حال دعوتوں اور تحریکوں کا بھی ہوتا ہے۔ مادی مفادات کی حرص، مال و دولت اور سیم و زر جمع کرنے کی لالچ دعوت کا تیا پانچا کر دیتی اور اس کے اثرات زائل کر دیتی ہے۔ پھر تو لوگ داعی کی سچائی اور صدق وصفا میں شک کرنے لگتے ہیں اور اس پر یہ لزام لگنے لگتا ہے کہ اس کا

مقصد رضائے الٰہی نہیں بلکہ دین و اصلاح حال کے نام سے متاعِ دُنیا جمع کرنا ہے۔ اور جب عوام کے اندر یہ خیال پیدا ہو جائے تو وہ کبھی اللہ کے دین کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکتے اور اصلاح کی دعوت دینے والے ہر مخلص و صادق شخص کو بھی ان کی طرف سے تعذیب و ایذا دہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

(۱۰)...... جن غزوۂ اُحد میں جبکہ مسلمان اِدھر اُدھر سراسیمگی اور مایوسی کے عالم میں بھاگ رہے تھے، نسیبہ اُمّ عمارہ اور ان کے شوہر اور اولاد رضی اللہ عنہم کا رسول اللہ ﷺ کی حفاظت میں سینہ سپر رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کی دعوت کی اشاعت اور غلبہ میں عورت کا بڑا زبردست ہاتھ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمارے دور میں مسلمان عورت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دعوتِ اسلامی کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو از سرِ نو سمجھے، نوخیز لڑکیوں، بیویوں اور ماؤں کو اسلام کی دعوت دے اور اپنے بچوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت، اسلام اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کا جذبہ اور معاشرہ کی بھلائی اور بہتری کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کا داعیہ اُبھارے۔

جب تک دعوت کا میدان مسلمان خواتین اور دوشیزاؤں سے خالی رہے گا یا ان کی کافی تعداد اس میدان میں نہ ہو گی، اس کے اثرات محدود اور کمتر ہوں گے اور تحریک اصلاح و انقلاب ادھوری رہے گی تا آنکہ یہ نصف انسانیت خیر کی دعوت سنے اور اس کے ضمیر میں خیر کی محبت اور دین کی راہ میں اقدام و عمل جاگے اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنے کا جذبہ پیدا ہو۔

(۱۱)......غزوۂ اُحد میں رسولِ اکرم ﷺ کا اذیت اور زخموں سے دوچار ہونا اس امر کا اعلان ہے کہ داعیانِ دین کے جسم زخموں سے چور ہوں گے، اس راہ میں قید و بند کے ذریعے اُن کی آزادیاں سلب کی جائیں گی۔ اور دارورسن نیز قتل و خون سے سابقہ پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز میں فرمایا ہے:

﴿ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝۲ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ۝۳ ﴾

(سورۃ العنکبوت : ۲ تا ۳)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے''۔اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم اُن سب کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔اللہ کو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچّے کون ہیں اور جھوٹے کون۔''

(۱۲)......مشرکین نے غزوۂ اُحد میں حمزہ رضی اللہ عنہ کا جس طرح مُثلہ کر دیا، وہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ دُشمنانِ اسلام ہر قسم کی انسانیت اور ضمیر کی آواز سے خالی اور محروم ہوتے ہیں۔ بھلا مقتول کا مُثلہ کرنے سے اسے کیا تکلیف پہنچ سکتی ہے؟ ذبح کی ہوئی بکری کی کھال کھینچنے سے اسے کوئی درد اور پریشانی نہیں ہوتی، البتہ یہ حرکت اس سیاہ بغض اور کینہ کی دلیل ہے جس سے ان کے دل بھرے ہوتے ہیں اور ان وحشیانہ افعال و حرکات کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں جن سے ہر صاحبِ وجدان اور اہلِ ضمیر شخص کو کرب محسوس ہوتا ہے۔

غزوۂ اُحد میں مشرکین نے مسلمانوں کی لاشوں کے ساتھ جو کچھ بھی کیا، وہی حرکت جنگِ فلسطین میں یہود نے ہمارے مقتولین کے ساتھ دہرائی۔ یہ دونوں فریق ایک ہی مقصد و منزل کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور دونوں کے ان مجرمانہ افعال کا ایک ہی محرّک نظر آتا ہے، وہ یہ کہ اللہ اور اس کے رسولوں علیہم السلام اور یومِ آخرت پر سچے دل سے ایمان لانے والوں کی زندگی دوبھر کر دی جائے اور صراطِ مُستقیم سے ہمکنار افراد اور جماعتوں کے خلاف کینہ و بغض کا اظہار ہو۔

(۱۳)......غزوۂ بدر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ تبدیل کرنے کی بابت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کا مشورہ قبول کر لیا، اسی طرح غزوۂ خیبر میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشوروں کو اہمیّت

دی۔ اس سے ان آمروں اور ڈکٹیٹروں کا غرور وتکبّر ٹوٹ جاتا ہے جو قوم کی مرضی اور اس کی رائے کے بغیر اس پر مسلّط رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی عقل و رائے پر حد درجہ اعتماد کر کے قوم کی آراء اور خیالات کو ٹھکرا دیتے ہیں اور اپنے ملک کے صاحبِ عقل و دانش، حکماء و مفکّرین سے مشورہ طلب کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ جب رسولِ اکرم ﷺ۔ جن میں اہلیت و صلاحیت ہونے کی وجہ سے اللہ نے آپ ﷺ کو رسالت کا بوجھ اُٹھانے کے لیے منتخب کیا۔ جنگی و دنیوی معاملات میں اپنے ماہر صحابہ رضی اللہ عنہم کی آراء اور مشوروں کو اہمیّت دیتے تھے اور ان سے کبھی یہ نہ کہتے تھے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ بس میرا حکم سن لینا تم لوگوں کے لیے کافی ہے۔ آپ ﷺ نے جن معاملات کے سلسلے میں وحی نازل نہیں ہوئی ان میں ساتھیوں کے مشوروں اور خیالات کو قبول فرمایا ہے تو ان آمروں اور جابروں کے لیے گنجائش کیسے نکل سکتی ہے جن میں اکثر عقل وعلم اور تجربہ میں عام انسانوں پر کوئی فوقیت نہیں رکھتے، بس حالات کی سازگاری سے فائدہ اٹھا کر وسائل حکومت کے ذریعے عوام کی گردنوں پر سوار ہو جاتے ہیں؟! یہ لوگ حکومت چلانے کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ اپنے محکومین سے علم و ثقافت اور تجربات میں کم تر ہوتے ہیں۔ کیا ان پر واجب نہیں ہے کہ اہلِ نظر سے مشورہ کریں اور تجربہ کار افراد کے تجربات سے اور خیر خواہوں کی نصیحت و خیر خواہی سے فائدہ اُٹھائیں؟

قریب و بعید کی تاریخ کے واقعات بتاتے ہیں کہ ڈکٹیٹروں (Dictators) کے غرور نے ان کا پتّہ صاف کر دیا اور پوری اُمت کا بھی۔ اور اُمت کو قعرِ مذلت وانحطاط میں اس طرح گرا دیا کہ دسیوں یا سینکڑوں سال بعد اس سے نکلنا ممکن ہو سکا۔ غزوۂ بدر اور خیبر میں حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کی رائے کو تسلیم کرنا ہر مخلص حاکم، ہر حکیم قائد اور ہر سچے داعی کے لیے اپنے اندر درس کا سامان رکھتا ہے۔

اسلامی حکومت کا اہم ترین شورائیت ہے :

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ (سورۃ الشوریٰ : ۳۸)

''اور وہ اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔''

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (سورۃ النحل : ۴۳)

''اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔''

(۱۴)...... ہر غزوہ میں نبی کرم ﷺ کی شرکت اور معرکہ آرائی اس بات کی دلیل ہے کہ قیادت صرف بہادر اور جرأت مند افراد ہی کو زیب دیتی ہے ۔ جو لوگ بزدل ہوں اور جرأت و بے باکی کی اعلیٰ صفات سے محروم ہوں وہ قوموں کی رہبری کر سکتے ہیں نہ فوجوں کی قیادت ۔ اسلامی تحریکوں اور خیر و معروف کی دعوتوں کی سربراہی ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ قائد اپنے قول وفعل میں جری وبے باک اور بہادر ہو تو اس سے متبعین کے اندر جو ایثار وقربانی اور جاں سپاری پیدا ہوتی ہے وہ ہزاروں تقریروں سے بھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ سپاہی اور اعوان وانصار اپنے رہبر اور کمانڈر ہی سے قوت و طاقت اخذ کرتے ہیں اگر خود قائد دشمنوں سے مڈ بھیڑ کے وقت بزدلی دکھائے اور تنگیوں اور مصائب میں قدم پیچھے ہٹالے تو اس کاز (Cause) اور مقصد کو زبردست نقصان پہنچتا ہے، جس کا وہ علمبردار ہے۔

(۱۵)...... فوج کے سپاہیوں اور تحریک کے کارکنوں پر لازم ہے کہ وہ قائد سے کسی ایسے معاملے میں اختلاف نہ کریں جس کے سلسلے میں وہ قطعی اقدام کرنے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ اس طرح کے قائد سے تبادلۂ خیالات کیا جاسکتا ہے، اسے اپنی رائے سے آگاہ کیا جاسکتا ہے، لیکن جب وہ کسی چیز کا قطعی فیصلہ کر لے تو اس کی اطاعت اور تعمیل پیروؤں پر واجب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوا۔ آپ ﷺ نے صلح کی شرائط طے کر لیں اور بعد میں واضح ہو گیا کہ یہ دعوت کے مفاد میں تھیں اور یہ کہ عارضی صلح فتحِ مبین کا پیش خیمہ تھی اور اس کے بعد دو سالوں کے اندر کئی گنا افراد حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے،

حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر ان شرائط کی بعض شقیں ناگوار گزری تھیں یہاں تک کہ بعض افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان ادب کے حدود سے تجاوز بھی کر گئے تھے۔ فتنۂ ارتداد کے وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہ معاملہ پیش آیا۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے تھی کہ مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے مدینہ خالی نہ کیا جائے، لیکن ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے اس کے برعکس تھی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعی فیصلہ جنگ کا کر لیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اور جنگ کے لیے آمادہ و تیار ہو گئے اور بعد کے حالات نے بتا دیا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جنگ کا جو فیصلہ کر لیا تھا اس سے اسلام جزیرۂ عرب میں اپنے پاؤں جما سکا اور مسلمان رُشد و ہدایت کی غرض سے فاتح بن کر دُنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے۔

(۱۶)......غزوۂ احزاب میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذریعے دشمنوں کے درمیان پھوٹ ڈلوادی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دُشمنوں کی جنگ میں چالبازی اور دھوکہ دینا جائز ہے بشرطیکہ کامیابی کا امکان ہو اور یہ کہ کم سے کم خوں ریزی اور فتح یابی کے لیے جو شکل بھی مناسب ہو، اسلام میں محبوب ہے، البتہ بے وفائی اور خیانت جائز نہیں ہے۔ یہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی اور فوجی حکمتِ عملی کا ایک حصّہ تھی۔ یہ اسلامی اخلاق و آداب کے منافی نہیں ہے کیونکہ جنگوں میں کم سے کم خوں ریزی کے لیے جدوجہد انسانی خدمت ہے۔

کفر و شرک اور فتنہ و فساد کو شکست دینے کی کوشش انسانی اور اخلاقی مفاد میں ہے جنگوں میں چالوں اور تدبیروں کا استعمال عین انسانی اخلاق ہے اس لیے کہ اللہ نے جنگ کی اجازت محض دین کی حفاظت، اُمّت کی حمایت اور عزّت و ناموس کے دفاع کے لیے دی ہے اور دشمنوں کو چالوں سے شکست دینا اس حق کو جلد غلبہ دلانے کی کوشش ہے جس سے یہ دُشمنانِ دین خار کھائے بیٹھے ہیں۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

((اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ)) [1]

''جنگ چال اور تدبیر کا نام ہے۔''

یہ اُصول تمام شریعتوں اور قوانین میں مسلّم ہے۔

(۱۷)......غزوۂ خندق میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا خندق کھودنے کی بابت مشورہ قبول کرلیا جانا اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اسلام دوسری قوموں کے مفید تجربات اور نفع بخش انکشافات سے استفادہ کرنے میں کوئی تردد اور جھجک محسوس نہیں کرتا بلا شبہ خندق نے دشمنوں کو مدینہ سے دُور رکھنے میں اہم رول ادا کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس مشورہ کو قبول کر لینا اس بات کا غماز ہے کہ دوسری اُمتوں کی اچھائیوں کو اختیار کرنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی تکلف نہ کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار اس طرح کی چیزیں اپنائی ہیں۔ جب بادشاہوں اور امرأ کو خطوط کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دینا چاہی تو کہا گیا کہ بادشاہ مہر بند خط ہی قبول کرتے ہیں، چنانچہ فوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر بنانے کا حکم دیا جس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ ہو۔ اور اسے تمام خطوط پر استعمال کرنے لگے۔

فتح مکہ کے بعد عرب کے مختلف گوشوں سے جب وفود اسلام قبول کرنے کے لیے آنے لگے تو عرض کیا گیا کہ بادشاہ اور سردارانِ قبائل کی عادت ہے کہ وہ نئے اور قیمتی کپڑوں میں وفود کا استقبال کرتے ہیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شاندار چادر خریدنے کا حکم دیا۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اس کی قیمت چار سو درہم تھی اور ایک روایت کے مطابق چار سو اونٹوں کی قیمت کے برابر تھی۔ [2] پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو زیب تن کر کے وفود کا استقبال کرنے لگے۔ یہ اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال ہیں جو آخری دین اور قیامت تک رہنے والی شریعت کے

---

[1] صحیح بخاری: ۳۰۲۹، ۳۰۳۰۔ صحیح مسلم: ۱۷۳۹، ۱۷۴۰ وقال الالبانی: صحیح متواتر۔ فقه السیرة: ۳۰۵.

[2] یہ روائتیں ہمیں نہیں مل پائیں، بظاہر مبالغہ آمیز لگتی ہیں، واللہ اعلم۔ (ابو عدنان)

ساتھ بھیجا گیا تھا اس لیے اس دین کے پیروکاروں کے لیے مناسب اور مفید ہے کہ وہ ہر زمان و مکان اور ہر ماحول میں دوسری قوموں کی اچھائیوں کو اختیار کریں جو ان کے لیے مفید ہوں اور شریعت کے احکام اور اس کے عام اصولوں سے نہ ٹکراتے ہوں۔ اس اخذ واکتساب کی ممانعت جمود ہے جسے اُس اسلام کا مزاج ہرگز قبول نہیں کرتا جو اپنے دستور میں داعیٔ دین سے کہتا ہے:

﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿١٧﴾ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ﴾

(سورة الزمر: ١٧-١٨)

''(اے نبی!)، بشارت دے دو میرے اُن بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔''

یہ اس رسول ﷺ کے مزاج سے بھی میل نہیں کھاتا جس کے دوسری قوموں سے استفادہ کی مثالیں ہم اوپر پڑھ چکے ہیں اور جو خود کہتا ہے:

((الحكمة صاله المؤمن فحيث وجدها فهوا حق بها)) [1]

'' حکمت مؤمن کی متاعِ گم شدہ ہے وہ جہاں کہیں اسے پائے اس کا زیادہ حقدار ہے۔''

اور آخری دور میں مسلمان جب غفلت کا شکار ہوئے خاص طور پر یورپ کی بیداری کے بعد جب اسلام کے اس اہم اصول سے کنارہ کش ہوگئے تو شکست وریخت اور زوال و انتشار سے دوچار ہوگئے اور زندگی کی دوڑ میں سب سے پیچھے رہ گئے جبکہ اغیار آگے نکل گئے:

﴿وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿٤١﴾﴾ (سورة الحج: ٤١)

''اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔''

---

[1] ضعيف الترمذي: ٢٦٨٧، ضعيف الجامع: ٤٣٠١، ضعيف ابن ماجه: ٤٩٦٦.

(۱۸)...... غزوۂ موتہ میں اسلامی لشکر کو آپ ﷺ نے جو نصیحتیں کیں ان سے اسلامی جنگوں پر انسانی رحمت وشفقت کی چھاپ نمایاں ہوتی ہے۔ اسلام ان لوگوں سے جنگ نہیں کرتا جو خاموش اور پُر امن ہیں اور اپنے راستے کی تمام چیزوں کو بیخ و بُن سے اکھاڑ نہیں دیتا اِلَّا آنکہ سخت ضرورت در پیش ہو۔ آپ ﷺ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اور بعد کے مسلمانوں نے بھی ان وصیتوں کا خیال رکھا؛ چنانچہ ان کی جنگیں تاریخ کی سب سے زیادہ رحمت وشفقت سے معمور جنگیں تھیں۔ یہ لوگ عین جنگ کی حالت میں اسلامی اخلاق و کردار کے سب سے زیادہ نمونہ اور حالتِ صلح میں دوسروں سے زیادہ رحیم تھے۔ اس معاملے میں تاریخ نے مسلمانوں کے روشن ترین کارنامے درج کر رکھے ہیں جبکہ غیروں کی تاریخ حد درجہ سیاہ ہے اور آج تک یہ ریکارڈ قائم ہے۔ ایک طرف وہ وحشت و درندگی ہے جس کا مظاہرہ صلیبیوں نے فتحِ بیت المقدّس کے بعد کیا اور دوسری طرف وہ رحم دلانہ انسانیت ہے جس کا اظہار صلاح الدین ایوّبی کے ذریعہ ہوا۔ وہ حیوانیت اور بہیمیّت کون بھول سکتا ہے جس کا مظاہرہ صلیبیوں نے بعض اسلامی حکومتوں مثلاً: طرابلس اور بصرہ پر قبضہ کے بعد کیا جبکہ مسلمانوں، فوجوں اور سرداروں کی رحمت اور شفقت تھی، جس نے ان ممالک کو واپس چھیننے کے بعد وہاں کے عیسائی باشندوں کی حفاظت کی۔ آج ہم یوروپی ممالک کے نفاق کا شکار ہیں۔ زبان سے وہ تہذیب، لسانی رحمت، تمام قوموں کے لیے خیر و بھلائی کی محبت رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ملکوں کو تہس نہس کر رہے ہیں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کا خون بہا رہے ہیں۔ ہمارے دور میں ظالم و غاصب اسرائیل نے فلسطین پر اپنی سلطنت قائم کر لی اور دیر یاسین، قبیہ، صیفا، یافا، عسکا، صفد، اور دوسرے دیہاتوں اور شہروں میں اس کی بر بریت اور درندگی کا ننگا ناچ پوری دُنیا نے دیکھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ سلطنت انسانیت کی دعویدار ہے اور عمل اس کے برعکس ہے، لیکن ہم انسانیت کے لیے کام کرتے ہیں اور اسی کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو جنگ و صلح میں اخلاقی

اُصولوں کی پابند ہے اور اسے ہم ضمیر کے اطمینان اور کامل انشراح کے ساتھ نافذ کرتے ہیں جبکہ ان کے دلوں میں ان اصولوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، اسی لیے وہ منافقت اور مکّاری کے ساتھ اس کا اعلان کرتے ہیں، لیکن ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جو قوی ہے، رحیم ہے اس لیے ہماری قوت باعثِ رحمت ہوگی۔

اُن میں دوستوں سے تعلقات اور دشمنوں سے جنگ میں اللہ سے محبت کا کوئی تصور ہی نہیں جھلکتا۔ ہماری جنگیں انسانیت کی بھلائی کے لیے ہوتی ہیں اس لیے ہم لوگوں پر رحمت و شفقت کی بارش کرتے اور ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرتے ہیں، لیکن ان کی جنگیں لوٹ مار، اقتدار و حکومت اور غلبہ و استعمار کے لیے ہوتی ہیں اسی لیے وہ عوام النّاس کے بدترین دشمن ہوتے ہیں۔

ہماری جنگیں اپنی سرزمین، اپنے حقوق اور اپنی عزّت کے دفاع کے لیے ہیں۔ اس قوم کے سامنے اصولوں کی دُہائی دینا عبث ہے جو رحمت و شرافت اور انسانیت سے نا آشنا ہیں۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان سے مسلسل برسرِ پیکار ہیں اور ان معرکوں میں اپنے رسول ﷺ اور اپنی شریعت کے اصولوں کو دانتوں سے پکڑے رہیں تا آنکہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کردے اور وہ سب سے بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۱۹)......فوج جب تک خالص، مخلص اور بہادر سپاہیوں پر مشتمل نہ ہو اور بزدل، کمینہ صفت تھڑ دلے اور لالچی آدمیوں سے پاک نہ ہو، دشمنوں کے مقابلے میں فتح حاصل نہیں کر سکتی غزوۂ حنین میں یہی ہوا۔ یہی حال دعوتوں اور تحریکوں کا بھی ہے۔ یہاں تالی بجانے والوں کی کثرت درکار نہیں ہوتی بلکہ مخلص، جاں نثار اور انقلابی افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۲۰)......رسولِ اکرم ﷺ کی جنگوں اور معرکوں سے یہود کا موقف، اور ان کے سلسلے میں آپ ﷺ کا موقف بھی واضح ہوتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ پہلے دن سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ ان سے صلح و آشتی کے تعلقات ہوں، انہیں دین و ملکیّت کی پوری

آزادی دی جائے اور اس کے لیے ایک تحریر بھی تیار کرائی، لیکن یہ قوم بڑی غدار اور مکّار ہے۔ چند ہی دنوں میں اس نے آپ ﷺ کے قتل کی سازش کی، جس کی وجہ سے غزوۂ بنونضیر پیش آیا۔ پھر جنگِ احزاب میں انہوں نے عہد شکنی کی اور دُشمنوں کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے غزوۂ بنوقریظہ کی مہم سر کرنی پڑی۔ اس کے بعد ہر طرف سے ہتھیار کی فراہمی کے لیے اور سازشوں کے جال بننے کے لیے جمع ہو گئے اور خفیہ طور سے مدینہ اور مسلمانوں کا صفایا کرنے کی ٹھان لی جس کے نتیجے میں خیبر کا معرکہ پیش آیا۔

یہ وہ قوم ہے جو حسنِ سلوک کی مستحق نہیں ہے۔ اس کے کسی وعدے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہ جب بھی موقع پائیں گے اسے پاؤں تلے روندیں گے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ جو رویہ اپنایا کیا وہ غلط تھا؟ اور کیا یہ مناسب ہوتا کہ آپ ﷺ ان کی چالبازیوں، عہد شکنیوں اور خیانتوں کو برداشت کرتے اور ہمیشہ آپ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی طرف سے سازش، فتنہ اور مکاری کے خدشے میں مبتلا رہتے اور قلق و اضطراب کے ماحول میں زندگی گزارتے؟ نبی ﷺ نے اپنی دُور اندیشی سے جدید سلطنت کی حصاریں مضبوط کیں۔ پورے جزیرۂ عرب میں اسلام کی اشاعت کی انتظام کیا اور اس کے بعد پورے عالم میں اس کی اشاعت کا مکمل اور محفوظ بندوبست کرنے کے لیے یہ سخت پالیسی اپنائی۔ آپ ﷺ کی اس پالیسی پر کسی یہودی، متعصّب یا استعمار پسند فرد ہی کو اعتراض ہوسکتا ہے اور یہود کا تو آج تک ریکارڈ رہا ہے کیا ان کا پورا وجود سازشوں، خیانتوں اور فتنہ انگیزیوں سے عبارت نہیں ہے؟ آج ہمارے دور میں کیا ان کا یہ کردار نمایاں نہیں ہے؟ جنگِ فلسطین اور قیام اسرائیل سے پہلے ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود تھے جو ان کی چکنی چپڑی باتوں کے بھرم میں آ جاتے تھے اور ان کے ساتھ تعاون کی دعوت دیتے تھے۔ کچھ لوگ تھے جو بڑی طاقتوں کی دعوت پر ان کے ساتھ تعاون و اشتراک کی جانب مائل تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہ چھوٹی سی سلطنت ہمارے سینے پر مونگ دل رہی ہے، لیکن قیام اسرائیل کے

بعد کوئی ان کے ارادوں سے دھوکہ کھانے والا نہیں ہے اور ہم ان کی سازشوں سے اسی وقت نجات پا سکتے ہیں جب رسولِ اکرم ﷺ کی دور اندیشی اور بصیرت کو استعمال کریں اور ان کے معاملے میں آپ ﷺ کی پالیسی کو برتیں تاکہ اپنے ملکوں کے سلسلے میں ہمیں اطمینان ہو اور تمام قوموں تک اسلام اور سلامتی کا پیغام پہنچانے میں ہم ایک نیا کردار ادا کرسکیں۔

یہ ایک امانت ہے جسے ہم ایمانداری اور سچائی کے ساتھ نئی نسل تک پہنچا رہے ہیں ہوسکتا ہے کہ یہ نسل وہ کارنامے انجام دے جو ہماری بے یارو مددگار نسل نہ انجام دے سکی۔

(۲۱)......غزوۂ موتہ رُومیوں اور مسلمانوں کی اوّلین جنگ تھی۔ اگر غسّانی عربوں نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد کو قتل نہ کیا ہوتا تو ممکن تھا کہ یہ کشمکش نہ ہوتی۔ لیکن اس نے قاصد کو قتل کر دیا جو تمام شریعتوں اور قوموں میں ایک دشمنانہ جنگی جرم سمجھا جاتا ہے اور پڑوسی ملک کی نیت کی خرابی پر دلالت کرتا ہے نیز اس سے شر انگیزی اور فتنہ انگیزی کا پتہ چلتا ہے، اسی لیے نبیٔ اکرم ﷺ نے لشکر بھیجنا ضروری سمجھا تاکہ اس نئی مملکت کی طاقت سے وہ متاثر ہوں اور اس پر چڑھائی کا ارادہ نہ کرسکیں۔ جب مسلمان مؤتہ پہنچے تو اُنہوں نے رُومیوں اور ان کے باجگزار عیسائی عربوں کی فوجِ کثیر دیکھی جس کی تعداد مؤرخین نے دو لاکھ بتائی ہے۔ ہرقل کا بھائی اس فوج کی قیادت کر رہا تھا اور موجودہ عمّان کے قریب مآب میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ جس سے نبیٔ اکرم ﷺ کے خدشہ کو تقویت مل گئی کہ یہ ایک نئی آزاد مملکت کا قیام برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے اور اپنی نوآبادیت اور چودہراہٹ کو خطرے میں دیکھ کر اس پر حملہ کریں گے۔ اس طرح مسلمانوں اور رُومیوں میں جنگ کا آغاز ہوا۔

(۲۲)......غزوۂ تبوک میں واضح نشانیاں ہیں کہ کس طرح سچا ایمان مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرتا ہے ان کے ہاتھ انفاق فی سبیل اللہ میں کتنے لمبے ہوتے ہیں اور اللہ کی راہ میں انہیں گرمی و سختی اور تھکان و مصیبت کتنی شیریں معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے جب مومنینِ صادقین میں سے تین افراد بغیر کسی عذر کے جنگ میں نہ جا سکے تو رسول ﷺ نے ان کا

بائیکاٹ کرنے کا حکم دیا۔ ان کی بیویوں اور باپوں کو ان سے گفتگو کرنے سے روک دیا گیا۔ جن میں سے کسی مسلمان نے اپنے آپ کو مسجد کے سُتون سے بندھوایا اور کوئی اپنے گھر میں منہ چھپائے روتا رہا یہاں تک کہ جب مسلمانوں نے بغیر عذر کے جنگ سے پیچھے رہ جانے کی اہمیت اور گناہ کو محسوس کر لیا اور اس سے بلیغ نصیحت قبول کر لی تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔

(۲۳)...... فتح مکہ میں جو نصائح اور عبرت آموز پہلو ہیں ان کی تشریح میں صفات کی تنگ دامانی مانع ہے۔ ہم اس میں داعی رسول ﷺ کا مزاج دیکھتے ہیں جو اپنے مخالفوں سے ذاتی انتقام نہیں لیتا۔ اکیّس سال کی مسلسل مخالفتوں اور مزاحمتوں کے بعد جب اللہ نے آپ ﷺ کو فتح سے نوازا اور نصرت عطا فرمائی تو انہیں معاف فرما دیا، ان کی آزادی برقرار رکھی اور ان کے ساتھ بھائی کا سلوک کیا۔ اس طرح کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لیکن آپ ﷺ نے یہ رحیمانہ برتاؤ کیا۔ آپ کی دعوت کا مقصد غلبہ و اقتدار نہ تھا بلکہ آپ ﷺ تو ہادی و مرشد اور عقل و ذہن کو فتح کرنے والے بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے جب مکہ میں داخل ہوئے تو خشوع و خضوع سے گردن جھکی ہوئی تھی۔ اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ فخر و غرور کا نام تک نہ تھا۔

(۲۴)...... اہلِ مکہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے جو معاملہ کیا اس میں ایک زبردست حکمت تھی۔ اللہ کو معلوم تھا کہ عرب سارے عالم پر اسلام کا پرچم لہرائیں گے اس لیے اہلِ مکہ جو پوری عرب قوم کے رہنما تھے، کو زندہ رکھا تا کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور اس کے بعد ہدایت و روشنی کے اس پیغام کو تمام قوموں تک لے جائیں۔ اس راہ میں اپنی جان و مال قربان کریں جس سے قومیں اندھی تقلید سے نکل سکیں اور تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں آ سکیں۔

(۲۵)...... ایک اور اہم پہلو قابلِ غور یہ ہے کہ ناقابلِ تصور قلیل ترین مدّت میں اللہ

نے اس دعوت کو غلبہ عطا کیا۔ یہ نبی ﷺ کی رسالت کی صداقت کی ایک دلیل ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اللہ کی وہ دعوت ہے جس کی حفاظت، اس پر ایمان لانے والوں اور اس کا پرچم بلند کرنے والوں کی مدد اور نصرت کی اس نے ضمانت لے لی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی دعوت کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا جبکہ یہ دعوت برحق ہے، رحمت اور روشنی کی پیامبر ہے اور اللہ بھی برحق ہے۔ رحمٰن ہے رحیم ہے اس کی رحمت ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، پھر بھلا اللہ کی روشنی کو کون بجھا سکتا ہے! وہ کیسے پسند کر سکتا ہے کہ باطل کو حق پر آخری فتح نصیب ہو اور درندگی، حیوانیت اور فساد کو رحمت و اصلاح اور امن و آشتی پر قبضہ حاصل ہو جائے؟

اللہ کے رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے پیارے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اُحد اور حنین کی جنگوں میں کافی زخم آئے۔ یہ دعوتِ اسلامی کی راہ میں ناگزیر ہے اور:

﴿وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝﴾

(سورة الحج: ٤٠)

”اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔“

بعد از فتحِ مکہ تا وفاتِ رسول اللہ ﷺ

- ❁ غزوۂ حنین
- ❁ بتوں کا استیصال
- ❁ غزوۂ تبوک
- ❁ حجۃ الوداع
- ❁ لشکرِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کی تیاری
- ❁ وفاتِ رسول ﷺ

غزوۂ حنین
(عِبَر و نصائح)

فتحِ مکہ کے بعد جب قریش کی اکّیس سالہ مخالفت ختم ہوگئی اور وہ خاموش ہو گئے تو قبیلۂ ہوازن رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے پر کمر بستہ ہو گیا جس کے نتیجے میں حنین کا معرکہ کارزار گرم ہوا جس کی تفصیلات ہمیں سیرتِ ابنِ ہشام میں ملتی ہیں۔ [1] ہم اس معرکہ کے نصیحت آمیز پہلو نیچے درج کرتے ہیں:

(۱)...... مالک بن عوف نصری نے دُرید بن الصمّہ جیسے تجربہ کار اور سِن رسیدہ شخص کی بات نہیں مانی اور محض سرداری کے لالچ میں اور اس غیرت میں کہ کہیں قوم کے لوگ یہ نہ کہیں کہ ایک طاقتور نوجوان نے ایک بوڑھے کی بات مان لی، اس نے حملہ کیا۔ اگر اس نے درید بن صمّہ کی بات تسلیم کر لی ہوتی تو اپنی قوم کو عظیم مالی خسارہ سے اور عورتوں کو غلامی کی ذلّت سے بچا سکتا تھا، لیکن غرور وتکبّر اور لیڈری کا جوش قوم کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے اور انجامِ کار سخت افسوس ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بے جا پندار اور غرور کی وجہ سے اسلام کی اس قوت کے سامنے وہ جھکنے پر تیار نہ ہوا جس کے آگے قریش شدید کشمکش اور جاں گسل جنگوں کے بعد گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور اس خبط میں مبتلا ہو گیا کہ اس کے پاس جو جنگجو افراد ہیں، مال و دولت کا جو انبار ہے اُس کی بنیاد پر اسلام کی اس نئی قوت پر غلبہ پا سکتا ہے،

[1] سیرت ابن ِ هشام ٤ / ٦٠ تا ٩٠ بتحقیق طٰہ عبدالرؤف سعد۔ نیز دیکھیے زیرِ نظر کتاب ص: ۹۸ تا ۱۰۰۔

پھر غرور و تکبّر کی انتہا یہ ہوئی کہ عورتوں ، بچوں اور مال متاع کو بھی میدانِ جنگ میں لے آیا تا کہ شکست نہ ہو۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ مسلمان جن سے اسے مقابلہ درپیش ہے وہ نصرت اور فتح کو دولت ، ہتھیار اور افراد پر منحصر نہیں سمجھتے بلکہ وہ عزیز و جبّار اللہ رب العزت کی طاقت کا سہارا لیتے ہیں اور انہیں اللہکے جنّت و فتح کے وعدوں پر ایمان و یقین ہوتا ہے اور عورتوں ، بچوں اور مال و متاع کی حفاظت انہیں شکست سے روک نہیں سکتی بلکہ شکست سے روکنے والی چیز اجرِ آخرت کی اُمید اور اُس سزا کا خوف ہے جس کی اس نے میدانِ جہاد سے فرار اختیار کرنے والوں کو دھمکی دی ہے:

﴿وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾

(سورة الانفال : ١٦)

’’جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری، ...... اِلاّ یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لیے، تو وہ اللہ کے غضب میں گِھر جائے گا۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور وہ بہت بُری جائے بازگشت ہے۔‘‘

اس طرح مالک بن عوف اور اس کا قبیلہ ہوازن اس کے ساتھ شکست سے دوچار ہوئے اور اس کا بے جا پندار اور غرور صرف اسی کی ہلاکت کا سبب نہیں بنا بلکہ اس کی پوری قوم کو تباہی کے کھڈ میں لا گرا دیا کیونکہ اس نے پندار اور غرور میں اس کا ساتھ دیا تھا اور اس نے انہیں یہ دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ تلوار سے اپنا پیٹ پھاڑ لے گا تو وہ اس کی دعوت پر دوڑ پڑے۔ اگر انہیں نے اپنے بزرگ تجربہ کار درید کی بات مان لی ہوتی اور نوجوان لیڈر کے کبر و غرور کا شکار نہ ہوتے تو اس روز بد کے دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔ انہیں اس مغرور لیڈر کی خفگی کا خوف تھا۔ اگر وہ اپنے آپ سے پوچھتے کہ اگر یہ خفا ہو جائے تو کیا بگڑے گا؟ تو اس کا جواب یہی ہوتا کہ ایک لیڈر سے محروم ہو جائیں گے اور اس سے ان

کا نقصان کیا ہوتا؟ ایک ایسے مغرور اور انانیت پسند سردار کے خاتمے سے انہیں کیا نقصان پہنچتا جو اپنے سے تجربہ کار اور واقفِ حال شخص کے مشوروں کو ٹھکرا کر جنگ میں کود پڑتا ہے؟ کیا ایک شخص کی زندگی کی قیمت ایک قبیلہ یا تمام عوام النّاس کی زندگیوں کی قیمت کے برابر ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مغرور اور کبر پسند رہنماؤں کی خواہشات کے سامنے اجتماعی طور پر ہتھیار ڈالنے سے سختی سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ وفرعون کے قصّے میں کہتا ہے:

﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ۝ فَلَمَّا آسَفُونَا انتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا لِّلْآخِرِينَ ۝﴾

(سورة الزخرف: ٥٤ تا ٥٦)

"اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔ آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونۂ عبرت بنا دیا۔"

(۲)...... رسول اللہ ﷺ نے مشرک صفوان سے سو (۱۰۰) زرہیں اور ہتھیار مُستعار لیے تھے، اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دُشمنوں سے جنگ کے لیے پوری تیاری کرنی چاہیے وہیں یہ جواز بھی نکلتا ہے کہ کافر سے ہتھیار خریدے جا سکتے ہیں یا مُستعار لیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اس سے کافر کی قوت میں اضافہ نہ ہوا اور وہ اسے مسلمانوں کو ستانے اور انہیں ضیق میں ڈالنے کے لیے استعمال نہ کرے۔ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے صفوان سے ہتھیار فتحِ مکہ کے بعد مُستعار لیے تھے اور صفوان اس وقت حد درجہ کمزور اور بے بس تھا اس کا اندازہ رسول اللہ ﷺ سے اس کے سوال کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس نے پوچھا تھا: اے محمد ﷺ، کیا یہ غصب کر رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا تھا: نہیں، یہ عاریۃً لیے جا رہے ہیں تا آنکہ انہیں لوٹا دیں۔ یہ مسلمانوں کا اپنے شکست خوردہ دشمنوں سے شرافت کا

معاملہ کرنے کی ایک مثال بھی ہے۔ اگر اللہ کے رسول بزور اس سے ہتھیار غصب کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے اور صفوان کچھ کہنے کی طاقت نہ رکھتا تھا، لیکن یہاں ایک نبی ﷺ کا طریقہ عمل کارفرما تھا۔ دُشمنوں پر قابو پانے کے بعد جبکہ جنگ ختم ہو چکی تھی اور ہتھیار ڈال چکے تھے، اب ان کے اموال کی حفاظت کرنی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم محمد ﷺ سے پہلے یا بعد میں کسی نے اس درجہ شرافت کا ثبوت دیا ہو۔

(۳)...... جب اللہ کے رسول ﷺ اس معرکہ میں جنگ کے لیے نکلے تو آپ ﷺ کے ساتھ بارہ ہزار افراد کی فوج تھی۔ ان میں دس ہزار تو وہ تھے جو مدینہ سے آپ ﷺ کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے فتحِ مکہ میں شرکت کی تھی یعنی انصار ومہاجرین اور مدینہ کے پڑوس میں رہنے والے مسلمان۔ اور دو ہزار مسلمان وہ تھے جو فتح کے بعد اسلام لائے تھے۔ ان میں سے اکثر وہ تھے جن کے دلوں میں ابھی تک اسلام کی ہدایت جڑ نہ پکڑ سکی تھی اور یہ اس وقت اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے تھے جب اسلام کو شکست دینے کی ان کی ساری چالیں ناکام ہو چکی تھیں۔ اس لشکر کے ایک طرف وہ لوگ تھے جو راست باز اہلِ ایمان تھے جنہوں نے دین و ایمان کی راہ میں اپنی جان اور مال کا سودا کر لیا تھا تو دوسری طرف وہ لوگ بھی تھے جن کا دین کمزور تھا، جو مجبوری اور کراہت کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اسلام کے خلاف کینہ رکھتے تھے اور اس کی فتح یابی سے جلن محسوس کرتے تھے۔ پوری فوج معنوی طاقت اور اہداف و مقاصدِ جنگ پر ایمان وتسلیم کے یکساں جذبے سے سرشار نہ تھی۔ کچھ لوگ مالِ غنیمت کے لالچ میں کھنچ آئے تھے، اس لیے آغاز میں شکست ہوئی تو باعثِ تعجب نہیں۔ اسی لیے اس کثرتِ تعداد کو دیکھ کر کہا گیا تھا:

((لَنْ نُّهْزَمُ الْيَوْمَ مِنْ قِلَّةٍ)) [1]

---

[1] البحر الزخام۔مسندالبزار ۱۳/ ۱۲۹ عن انس بلفظ:قال غلامٌ---موقوفاً وتکلم علی اسنادہ۔

''ہماری شکست قلّتِ تعداد کی وجہ سے نہ ہوگی۔''

یعنی اگر شکست ہوسکتی ہے تو معنوی معاملات کی وجہ سے جو انسان کے دل و دماغ سے متعلق ہیں، ان کے ایمان اور ان کے اخلاص وقربانی کے جذبے سے مربوط ہیں۔ یہاں اللہ کے رسول ﷺ نے ایک اہم اُصول ہمارے سامنے رکھ دیا ہے وہ یہ کہ نصرت اور فتح کثرتِ تعداد سے نہیں ہوتی نہ عمدہ ہتھیاروں سے ہوتی ہے بلکہ اس کا دارومدار معنوی طاقت پر ہے، جو جنگ کرنے والوں کے دلوں پر حاوی ہو اور انہیں فداکاری اور قربانی پر آمادہ کرے۔

قرآنِ کریم نے متعدّد مقامات پر یہی مضمون زور دے کر بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (سورۃ البقرۃ: ۲۴۹)

''بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے، اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔''

اس جنگ کے خاتمہ پر جو آیات نازل ہوئیں وہ انتہائی صراحت سے یہ مضمون بیان کرتی ہیں:

﴿وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (سورۃ التوبہ: ۲۵، ۲۶)

''ابھی غزوۂ حنین کے روز (اُس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اُس روز تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرور تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مؤمنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اُتارے جو تمہیں

نظر نہ آتے تھے اور منکرینِ حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔''

دورانِ سفر جب بعض مسلمانوں نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! جیسا ان لوگوں کا '' ذات انواط'' تھا ویسا ہی ایک ہمارے لیے'' ذات انواط'' تجویز فرما دیجئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے تم نے مجھ سے ایسی فرمائش کی ہے جیسے موسیٰ کی قوم نے موسیٰ سے کی تھی اور کہا تھا کہ:

﴿اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝۱۳۸﴾

(سورة الاعراف: ۱۳۸)

''ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔''

((وَالَّذِيْ نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَرْكَبُنَّ سُنَّةَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ))[1]

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ پچھلی قوموں کی ریت رہی ہے اور تم ان کی ایک ایک بات اور طریقہ کی پیروی کرو گے۔''

اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ یہ اُمت پچھلی اُمتوں کی تقلید کرے گی، اور اس میں اس سے ہوشیار کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ محض جہالت کی وجہ سے پچھلی قوموں کی تقلید کی جائے گی۔ اس لیے کہ جو قومیں خیر اور فساد کے چہروں کو پہچانتی ہوں گی اور نفع وضرر کے راستوں سے واقف ہوں گی، وہ خیر اور نفع ہی کو اختیار کریں گی اور فساد و خسران سے فرار اختیار کریں گی اور کسی ایسے راستے پر چلنے سے انکار کر دیں گی جو ہلاکت اور تباہی کی طرف جاتا ہو چاہے پچھلی قومیں اس راہ پر چل چکی ہوں۔ لیکن اگر وہ نتائج کی پروا کیئے بغیر وہ اسی راہ پر آنکھ بند کر کے چلتی رہیں تو گویا انہوں نے کسی چیز کو اس کی غیر مناسب جگہ

[1] صحیح ترمذی: ۲۱۸۰، السنة لابن ابی عاصم: ۷٦، مشکوٰة: ۵۳۳۵ وصححه الالبانی.

میں رکھ دیا اور اسی کا نام جہالت ہے اور اسی کی طرف موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو منسوب کیا تھا۔

جو اُمت اپنے آپ پر بھروسہ کرتی ہو، اپنی شخصیت کی قدر و قیمت سے واقف ہو، اس کے پاس خیر اور حق کا جو سرمایہ ہے اس پر مطمئن ہو اور اس کو چھوڑ کر نقصان دہ راستوں کو اختیار کرنے اور اپنے اصولوں کے منافی طریقوں پر چلنے سے انکار کرتی ہو، اگر تقلید کرتی ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اس کی شخصیت کمزور ہے، اس کی فکر میں اضطراب پایا جاتا ہے، وہ خواہشات کے سامنے سپر ڈال چکی ہے اور ضعف و انتشار کے گڑھے میں گر چکی ہے۔ یہی وہ جاہلیّت ہے جس سے اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، کتاب اور شریعت کے ذریعے ہمیں نکالا۔ علم اور جہالت اصلاحی تحریکوں کی نظر میں خواندہ اور ناخوندہ ہونے کو نہیں کہتے بلکہ ہدایت اور ضلالت اور شعور اور غباوت و کند ذہنی کو کہتے ہیں۔ جو اُمت اپنے نفع و نقصان کا شعور رکھے اسی کو عالم اُمت کہیں گے چاہے وہ غیر خواندہ ہو اور جو اُمت خیر اور معروف کو نہیں پہچانتی وہی جاہل ہے چاہے علوم و معارف کی کتنی ڈگریاں اُٹھائے پھرے اور مختلف ثقافتوں اور فنون کا احاطہ کر لیا ہو۔ قوموں کو جو چیز ہمیشہ ہلاکت و بربادی کے کھڈ میں گراتی رہی ہے، وہ اس کے سپوتوں کے جذبات و خواہشات پر جاہلیت کا غلبہ تھی۔ تاریخ سے پوچھئے، یونانی اور رُومی تہذیب کے زوال کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ ان پر جاہلیّت مسلّط ہو چکی تھی۔

تقلید میں گرفتار افراد جاہل ہیں چاہے علوم و معارف کی پوری دنیا روند چکے ہوں۔ وہ شیر خوار بچّے ہیں چاہے سن و سال کے لحاظ سے کتنے ہی بڑے ہو چکے ہوں اور جاہل بچّے رہیں گے جب تک کہ تقلیدِ جامد سے آزاد نہ ہو جائیں۔

(۵)...... اس معرکہ میں جب آغازِ جنگ میں مسلمان شکست کھا چکے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے منتشر ہو چکے تھے۔ شیبہ بن عثمان نے سوچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتقام لے کیونکہ اس کا والد جنگ اُحد میں قتل کر دیا گیا تھا۔ شیبہ کہتا ہے کہ جب میں اس نیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوا تو اچانک کوئی چیز سامنے آ گئی جس نے میرے دل کو جکڑ

لیا اور میں بے بس ہو کر رہ گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ آپ ﷺ مجھ سے محفوظ رہیں گے۔

سیرتِ رسول ﷺ میں اس طرح کے واقعات بکثرت ہوئے ہیں۔ مکّہ و مدینہ میں ابوجہل اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اس طرح کے معجزات رونما ہو چکے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو ایسا رُعب عطا کیا ہوا تھا جو قتل کی سازش کرنے والوں کو خوف زدہ کر دیتا تھا اور یہ صدق نبوت کی دلیل تھی اور اس بات کی شہادت تھی کہ اللہ اپنے نبی کو ہر خفیہ چال سے محفوظ رکھے گا اور آپ کی زندگی کو محفوظ و مامون رکھے گا تا آنکہ آپ پیغامِ رسالت کو عام کر دیں، اس امانت کو پہنچا دیں اور جزیرۂ عرب جاہلیّت سے پاک ہو جائے اور اس کے فرزند اس پیغام کو لے کر تعلیم و تزکیہ اور تہذیب کی غرض سے دُنیا میں پھیل جائیں۔ اگر اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی حفاظت کا یہ خاص انتظام نہ کیا ہوتا تو آغازِ دعوت ہی میں مشرکین آپ ﷺ کا کام تمام کر دیتے اور دین مکمل نہ ہو پاتا اور نعمتِ کار تمام نہ ہوتا، ہم تک رسالت کی روشنی اور اس کی ہدایت و رحمت نہ پہنچتی اور تاریخ میں وہ زبردست انقلاب نہ آیا جس نے اسلام کی اشاعت کے ذریعہ انسانیت کو بدبختی و ناکامی سے نکالا، قوموں پر غلبہ و استیلاء کا دور ختم کیا، ظلم و استبداد کی ہوا اکھاڑ دی اور ان بادشاہوں اور سرداروں کے پنجۂ استبداد سے عوام کی گلوخلاصی کرائی جنھوں نے ظلم و عدوان پر اپنا تخت بچھا رکھا تھا اور قوموں کے اندر بیداری و خودداری کی چنگاری نہ بھڑکنے دی تھی۔ یہ سب اِسی صورت میں ممکن ہو سکا جب اللہ نے اپنے رسول کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا یہاں تک کہ اس نے بے کم و کاست پوری امانت پہنچا دی۔ بلا شبہ یہ اللہ کا اپنے رسول ﷺ پر فضلِ عظیم تھا:

﴿وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝۱۱۳﴾ (سورۃ النساء: ۱۱۳)

''اور اللہ کا فضل تم پر بہت ہے۔''

اور اس کے رسول ﷺ کا پوری کائنات پر احسان ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۷﴾ (سورۃ الانبیاء: ۱۰۷)

''(اے نبی!) ہم نے تمھیں دُنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ داعیانِ دین کا اپنے دشمنوں کی چالوں اور گھاتوں سے بچ نکلنا اسی فضلِ عظیم کا تسلسل ہے جس کا آغاز اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی حفاظت سے کیا تھا۔

یہ داعیانِ دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ کی بارگاہ میں پناہ حاصل کریں، اسی کی عزت و اقتدار کو ڈھال بنائیں اور اس پر کامل اطمینان رکھیں کہ اللہ ان کا مددگار ہے، ان کا محافظ ہے اور جسے اللہ دشمنوں کے پھندے سے نکالنا چاہے وہ لامحالہ محفوظ رہے گا چاہے اُن کا اقتدار لامحدود ہو، مکروسازش اور جرم و جاسوسی کے ادارے کتنے ہی چاق و چوبند ہوں اور اصل حفاظت تو اللہ کی حفاظت ہے، مدد اسی کی کام آنے والی ہے، جسے وہ رسوا کرنا چاہے وہ ذلیل ہو کر رہے گا۔ اسی کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے۔

﴿إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ (سورۃ آل عمران: ۱۶۰)

''اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں۔''

ظالم انسان کی چال کتنی ہی زبردست ہو، اللہ ربِّ عادل و منصف کی مدد اس سے کہیں زیادہ طاقتور اور مستحکم ہے۔ داعیٔ دین بزدلی نہ دکھائے۔ مصلح خوف نہ کھائے، اللہ پر ایمان رکھنے والا حق کی تبلیغ و اشاعت سے باز نہ آئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (سورۃ الروم: ۴۷)

''اور ہم پر یہ حق ہے کہ ہم مؤمنین کی مدد کریں۔''

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ۝ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ (سورۃ المجادلہ: ۲۰، ۲۱)

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتے ہیں وہی ذلیل ترین لوگ ہیں۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے، فی الواقع اللہ زبردست اور زور آور ہے۔''

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دشمنانِ دین داعیانِ دین پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ تاریخ میں ایسا ہوا ہے کہ بعض داعیانِ اصلاح پر انہیں قابو حاصل ہو گیا اور انہوں نے ان کا کام تمام کر دیا۔ موت تو برحق ہے، ہر آدم کے بیٹے کو مرنا ہے اب اگر ظالموں کے ہاتھوں کسی کی موت لکھ دی گئی ہے تو یہ ایک اعزاز ہے جس سے اللہ نے اسے سرفراز فرمایا ہے۔ اللہ کی راہ میں ہر موت شہادت ہے اور دعوتِ دین کی راہ میں ہر تکلیف باعثِ شرف ہے اور اصلاح و دعوت کی راہ کی ہر آزمائش خلود اور ہمیشگی بخش دیتی ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ١٢٠ۙ﴾

(سورة التوبة : ١٢٠)

''اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقّت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں اور منکرینِ حق کو جو راہ ناگوار ہے اُس پر کوئی قدم وہ اُٹھائیں اور کسی دُشمن سے (عداوت حق کا) کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عملِ صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں مُحسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔''

(٦)...... آغازِ جنگ میں مورچوں اور کمین گاہوں سے مسلمانوں پر حملے کیے گئے جس کی وجہ سے ان کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا اور وہ رسول اللہ ﷺ سے بچھڑ گئے، آپ ﷺ کے ساتھ چند افراد باقی رہ گئے تھے۔ آپ ﷺ نے آواز لگانی شروع کی، اے لوگو! میری طرف آؤ، میں اللہ کا رسول ہوں، میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ لیکن اس نقّار خانے میں آپ ﷺ کی آواز دب کر رہ گئی، پھر آپ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو جو بلند آواز تھے، یہ حکم دیا کہ پُکارو: يَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ، يَا اَصْحَابَ السَّهرة (اے انصار! اے ببول

کے درخت والو!) چنانچہ مسلمانوں نے سنتے ہی لبّیک لبّیک کی صدا بلند کی اور دوڑ پڑے۔ جب ان کی آواز کسی آدمی تک پہنچتی تو وہ اسی وقت اپنے اونٹ سے کود پڑتا اور اپنی تلوار اور ڈھال لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہو جاتا یہاں تک کہ تقریباً سو آدمی جب آپ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے تو انہوں نے مقابلہ شروع کر دیا اور دونوں فریق گتّھم گتّھا ہو گئے اور آخر میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

یہاں عبرت و نصیحت کے گوناگوں پہلو موجود ہیں، داعیانِ دین اور سپاہیانِ اسلام کو یہاں ٹھہر کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگوں میں شکست بسا اوقات اس وجہ سے ہوتی ہے کہ عقیدہ و اصول کے علمبردار اپنے فکر اور نظریہ میں کمزور ہوتے ہیں، حق کی خاطر ان کے اندر اخلاص نہیں ہوتا اور اس کی راہ میں فنا ہونے کا جذبہ ناپید ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مشکلات و مصائب میں قائد اگر ثابت قدمی دکھائے، جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کرے اور اللہ کی مدد اور اس کی نصرت پر اسے کامل یقین ہو تو ہاری ہوئی بازی جیتی جا سکتی ہے، شکست فتح میں تبدیل ہوسکتی ہے اور جنگ کا پانسہ پلٹ سکتا ہے کمزور اور مذبذب افراد قوّی ہو سکتے ہیں اور مخلص اہلِ ایمان اپنے بہادر قائد کے اِرد گرد دوبارہ جمع ہو سکتے ہیں۔ جنگ کے آغاز میں ہونے والی شکست کے بعد جو لوگ آپ ﷺ کے ساتھ باقی بچ رہے تھے اور جنہوں نے آپ ﷺ کی آواز پر لبّیک کہا تھا، ان سب کی تعداد سو(١٠٠) سے زیادہ نہ تھی، لیکن وہیں سے جنگ نے پلٹا کھایا، اللہ کی نصرت کا آغاز ہوا، دشمنوں کی شکست و ریخت کی ابتداء ہوئی، ان کے دلوں میں وہن وضوف پیدا ہوگیا اور جیسے جیسے قائدِ تحریک ﷺ نے اعلان کیا کہ وہ حق پر ہیں اور اللہ مؤمنوں کے ساتھ ہے، ان کی معنوی طاقت دو آتشہ ہوتی گئی اور فدا کاری اور قربانی کا جذبہ جوان ہوتا گیا۔ ایسے نازک موقع پر آپ ﷺ کا ((اَنَـا رَسُـوْلُ اللّٰهِ)) ''میں اللہ کا رسول ہوں'' کہنا اور ایک دوسری روایت کی مطابق ((اَنَـا النَّبِیُّ لَا کَذِبَ: اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ)) ''میں پیغمبر

ہوں جھوٹا نہیں ہوں، میں فرزندِ عبدالمطلب ہوں۔'' کا پکارنا آپ ﷺ کے دعوائے نبوّت کی صداقت اور اللہ پر کامل یقین کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی معاملہ ایک قائد اور رہنما کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اسے مصیبتوں اور سختیوں میں اپنے اوپر مکمل قابو ہونا چاہیے، اپنے رب سے فریادرس اور پیوستہ رہنا چاہیے، اس کی نصرت اور حفاظت پر کامل یقین رکھنا چاہیے کیونکہ قائد کی خود اعتمادی، اپنے نصب العین سے سچی محبت اور اپنے پیغام کے لیے یہ فداکاری اس کی کامیابی پر منتج ہوتی اور عوام النّاس کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ اور مشکلات و شدائد میں راضی و مطمئن آلام و مصائب کو جھیلنے کی طاقت پیدا کرتی ہے۔

(۷)...... اس موقعہ پر اُمِّ سلیم بنتِ ملحان رضی اللہ عنہا نے جو کارنامہ انجام دیا وہ آغازِ اسلام میں مسلمان عورت کے شاندار کردار کا ایک پرتو تھا۔ یہ جنگ میں اپنے شوہر ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ موجود تھیں۔ حاملہ ہونے کی وجہ سے ایک چادر سے اپنی کمر کو باندھے ہوئے تھیں ان کے ساتھ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا اونٹ بھی تھا، جس کے بھاگ جانے کا اندیشہ ہوا تو اپنا ہاتھ اس کی نکیل سے باندھ دیا۔ انہیں اللہ کے رسول نے ﷺ دیکھا تو پوچھا: اُمِ سلیم! کیا بات ہے؟ کہا: میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، میں ان لوگوں سے جنگ کروں گی جو شکست کھا کر آپ ﷺ سے بھاگ رہے ہیں، جس طرح آپ ﷺ اپنے مخالفین سے جنگ کر رہے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اُمِ سلیم! کیا ان کے لیے اللہ کافی نہیں ہے؟ اُن کے ساتھ ایک خنجر بھی تھا۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اس کی موجودگی کا راز پوچھا تو جواب دیا کہ: یہ خنجر ہے جسے میں نے اس لیے لیا ہے تاکہ کوئی مُشرک مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کرے تو یہ اس کے پیٹ میں بُھونک دوں۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور اللہ کے رسول کی توجّہ ان کی باتوں کی طرف مبذول کرائی۔

یہ تھا مسلمان عورت کا کردار۔ اسی طرح مسلمان خواتین کو جری اور بہادر ہونا چاہیے تاکہ دفاعی معرکوں میں بنفس خویش شریک ہوسکیں، یہاں تک کہ جب ان پر حملہ ہو یا دشمن

ان کے قریب آئیں تو اپنا دفاع کرسکیں اور قیدی نہ بنائی جاسکیں۔ آغازِ اسلام میں مسلمان عورت کی جاں سپاری، قربانی اور بہادری کے بے مثال کارنامے اور روشن مثالیں ہیں جن سے ان مغربی مصنّفین اور مستشرقین کے چہروں پر کالک لگ جاتی ہے جو اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ اسلام عورت کو کمتر قرار دیتا اور اسے رُسوا کرتا ہے اور اس کے طبعی حدود میں معاشرے میں اس کے شایانِ شان مقام عطا نہیں کرتا بلکہ ان کی افترا پردازی نے یہاں تک غضب ڈھایا کہ وہ کہنے لگے کہ جنّت میں اسلام کے نزدیک عورت کا کوئی گزر نہیں ہوسکتا چاہے کتنی ہی نیکیاں کرے اور عبادت وخوفِ الٰہی کی کیسی ہی پاکیزہ زندگی گزارے۔

اس افترا پردازی کی تردید میں قرآن وسنت کے جو واضح نصوص موجود ہیں ان سے قطع نظر خود تاریخِ اسلام کو دیکھئے اس نے اسلام کی دعوت واشاعت اور اس کی راہ میں قربانی وایثار کے نسوانی نمونوں کا جو ریکارڈ محفوظ کر رکھا ہے وہ کسی اور دین اور نظریہ میں نظر نہیں آتا۔ معرکہ حنین میں اُمِ سلیم رضی اللہ عنہا کا یہ کارنامہ ان سینکڑوں مثالوں میں سے ایک ہے جو اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں۔ یہاں ہمیں اسلام کے متعصّب دشمنوں کی افترا پردازیوں کی تردید سے اتنی دل چسپی نہیں ہے جتنی اُمِ سلیم رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ میں درس وموعظت کے پہلو تلاش کرنے سے ہے۔ یہ پہلو مسلمان خواتین کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ از سرِ نو اسلام کی خدمت و اشاعت، نئی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت میں لگ جائیں۔ آج مسلمان عورت ایک طرف اگر صالح ہے تو نمازوں کے قیام، قرآن کی تلاوت اور محرمات سے اجتناب ہی کو تقویٰ اور صالحیت کے لیے کافی سمجھتی ہے اور دوسری طرف مغربی تہذیب کی لہروں میں بہی جارہی ہے، اسلام کے اخلاق و آداب کو پرے پھینک کر مغرب کے اخلاق و آداب قبول کر لیے ہیں، مسلم خواتین کا کردار پیچھے چلا گیا ہے اور مغربی دوشیزہ کا کردار آگے آ گیا ہے جس کی وجہ سے اسے اور اس کے پورے خاندان کو بدبختی اور نامرادی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر آج بعض لوگ یہ بیڑہ اُٹھائے ہوئے ہیں کہ مسلمان عورت کو اس کے اخلاق

وآداب اوران خصوصیات سے تہی دامن کردیں گے جن کے ذریعہ اس نے تاریخ کی شریف ترین اور بہادر اور غیور نسل کی تربیت کی تھی تو اسلام ، اس کی تاریخ اور خصوصاً اس کے رسول ﷺ کی تاریخ اسے دوبارہ دعوتِ عمل دیتی ہے کہ وہ نئے سرے سے اُٹھ کھڑی ہو اور اپنے فطری حدود میں رہ کر اسلام اور اسلامی معاشرہ کی خدمت انجام دے اور اپنی شرافت، نسوانیت، حیاء وعفّت اور حشمت و بیباکی کو دوبارہ حاصل کرے۔ کیا ہماری دیندار نوجوان لڑکیاں اور خواتین خدیجہ، عائشہ، اسماء، خنساء اور اُمِ سلیم رضی اللہ عنہن کا کردار ادا نہیں کرسکتیں؟ کیا ان بے مثال خواتین اور روشن ستاروں کا دور واپس نہیں آ سکتا؟ کیا یہ ناممکن ہے کہ آج اس معاشرے میں دسیوں خدیجہ، اسماٗ، عائشہ اور اُمِ سلیم رضی اللہ عنہن نکل آئیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے۔ صحیح تربیت، روشن اور باشعور ایمان اس طرح کی خواتین پیدا کرسکتا ہے۔ ہے کوئی بہادر خاتون جو دین وایمان کے دشمنوں کی افترا پردازیوں، گمراہیوں اور ٹھٹھے بازیوں سے قطع نظر کرکے مسلمان عورت کا شاندار کردار دوبارہ حاصل کرلے اور ہمارے اس دور میں اس کے عظیم کارناموں کا رجسٹر کھول دے؟

(۸)...... اس معرکہ میں اللہ کے رسول ﷺ کا گزر ایک عورت کی لاش سے ہوا جسے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا تھا اور لوگ وہاں بھیڑ لگائے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ایک عورت کو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قتل کیا ہے۔ تو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے کسی ساتھی سے کہا کہ خالد رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اوران سے کہو کہ اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کو کسی بچّے ،عورت یا مزدور پر ہاتھ اُٹھانے سے منع کیا ہے۔ [1]

---

[1] حدیث میں ہے:

((نَهٰى عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَان [اَلْوِلْدَان]))

''نبی ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔''

صحیح بخاری : ۳۰۵۱ ، صحیح مسلم : ۱۸۱۲ ، صحیح ابوداؤد : ۲۶۷۲ ، مسند احمد : ۸/ ۱۷۳ ، صحیح الجامع : ٦٩٧٢ .

بلا شبہ جنگوں کی تاریخ میں یہ اسلام کا منفرد کارنامہ ہے کہ اس نے کمزوروں، راہبوں، عورتوں، بچوں اور ان لوگوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے جو جنگ پر مجبور کیئے گئے ہیں یا کرائے کے سپاہی ہیں جیسے مزدور اور کسان وغیرہ۔ اسلام سے قبل اور اس کے بعد آج تک اتنا رحمدلانہ اور انسانیت نواز قانون کہیں نظر نہیں آتا۔ تمام قوموں میں یہ امر مسلّم ہے کہ دشمن قوم کے تمام افراد بلا استثناء جنگ کے دوران قتل کئے جا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس دور میں بھی جسے حقوقِ انسانی کا دور کہا جاتا ہے اور کمزور قوموں کی حفاظت کے لیے ایک عالمی ادارہ اقوامِ متّحدہ کے نام سے وجود میں آ چکا ہے، انسانی ضمیر اتنا شریف اور پاکیزہ اور بلند نہیں ہوسکا ہے کہ ان طبقات کے قتل کی حرمت کا اعلان کرے۔ ہم دو بڑی عالمی جنگوں کا دور دیکھ چکے ہیں کس طرح بسے بسائے شہر باشندگانِ شہر پر اُلٹ دیئے گئے، اجتماعی قتل اور خوں ریزی کس بُری طرح مچائی گئی، اسی طرح ہم اُن قوموں کے خلاف استعماری جنگوں کو بھی دیکھ چکے ہیں جو آزادی اور حقوق کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

آزادی اور انقلاب کی لہر دبانے کے لیے یہی سامراجی حکومتیں شہروں اور دیہاتوں کی تباہی اور ہزاروں لاکھوں افراد کی خوں ریزی کو جائز کر لیتی ہیں جیسا کہ فرانس، جزائر میں متعدد بار کر چکا ہے۔ انگریز اپنی نوآبادیات میں متعدد بار آگ اور خون کی ہولی کھیل چکا ہے اور آج پرتگال اپنی افریقی نوآبادیات میں یہی کچھ کر رہا ہے۔

اسی طرح ہمیں قدیم و جدید تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا کہ کرائے کے سپاہیوں اور مزدوروں اور کسانوں کو قتل کرنے سے روکا گیا ہو، لیکن اسلام نے آج سے چودہ صدی پہلے ہی اس سے روک دیا تھا۔ اور محض قانون بنانے پر اکتفا نہ کیا تھا بلکہ عمل کی دنیا میں اسے برت کر دکھایا بھی تھا۔ چنانچہ جنگِ حنین میں ہم دیکھتے ہیں کہ صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام عورت کے قتل پر غضبناک ہو جاتے ہیں اور اپنے ایک کمانڈر کو کہلا بھیجتے ہیں کہ عورتوں، بچّوں اور مزدوروں سے چھیڑ خانی نہ کی جائے۔ اور اپنی وفات سے چند دن پہلے

جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کو تیار کیا تو اسے نصیحت کی کہ عورتوں، بچوں، معذوروں، جنگ نہ کرنے والے راہبوں اور جنگ میں مدد نہ کرنے والے افراد کو قتل نہ کیا جائے۔ [1]

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جب جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تو اس حق، خیر، ہدایت اور انصاف کی راہ میں جنگ کرنے کی وصیّت کی۔ اسی طرح سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عراق میں اپنی فتوحات کے موقع پر اسی اصول کا پوری طرح خیال رکھا اور زراعت میں لگے ہوئے کسانوں سے کوئی تعرض نہ کیا۔ ہر جگہ کی اسلامی فوجوں کی یہی روایت رہی اور ہر زمانے میں ان بلند انسانی قدروں کا لحاظ رکھا گیا، جس سے اس سرزمین کی کسی فوج کی تاریخ واقف نہیں اسلامی فوجوں نے ان روایات کا کس حد تک خیال رکھا اس کا اندازہ صلاح الدین ایوبی کے اس رویہ سے بھی ہوسکتا ہے جو اس نے صلیبیوں پر غلبہ پانے کے بعد ان کے ساتھ روا رکھا اس کے بوڑھوں، دیندار لوگوں، عورتوں اور بچّوں بلکہ سخت ترین جنگ جوؤں کو بھی امان دی۔ انہیں اپنی فوجوں کی نگرانی میں اُن کے درمیان پہنچایا اور کوئی گزند نہ پہنچنے دی۔ جبکہ بیت المقدّس کی فتحیابی کے بعد صلیبیوں کا معاملہ اس کے برعکس رہا۔ انہوں نے بے وفائی، غدّاری، کمینگی اور سطحیّت و بربریت کا مظاہرہ کیا۔ صلیبیوں نے بیت المقدّس کے مسلمان باشندوں کو ان کی جان و مال کی امان دی، جب مسجدِ اقصیٰ کے اوپر انہوں نے سفید جھنڈا لہرایا، چنانچہ مسلمان اس دھوکہ میں آ کر مسجد میں جمع ہوگئے، لیکن بیت المقدّس میں جب صلیبی داخل ہوئے تو وہاں پناہ گزیں سارے مسلمانوں کا اجتماعی قتل عام کیا۔ اس میں ذبح کئے جانے والے علماءٔ وزہّاد، عورتوں اور بچّوں کی تعداد ستّر ہزار تک پہنچتی ہے، یہاں تک کہ ایک صلیبی مضمون نگار نے اس فتحِ مبین کی بشارت پوپ کو پہنچائی اور بڑے فخر سے کہا کہ:

سڑکوں پر اتنا خون بہا کر صلیبیوں کے گھوڑے گھٹنوں تک خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔

---

[1] دیکھیے گزشتہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۵۸ پر۔

آج ہم یہ بات اپنی فتوحات اور اپنے فوجیوں کی اُس تاریخ پر فخر کرنے کے لیے نہیں کہہ رہے ہیں جس کے بارے میں ''لوبون'' نے کہا ہے کہ:

عربوں سے زیادہ رحم دل اور عدل پرور فاتح تاریخ نے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ گفتگو چھیڑ کر ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ان مغربیوں سے کہیں زیادہ ہم رحمدل اور انسانیت پرور رہے ہیں اور یہ کہ مغربی جو انسانی حقوق، یوم اطفال، یومِ اُمّہات وغیرہ کی باتیں اپنی تہذیب کی بلندی ظاہر کرنے کے لیے کر رہے ہیں، محض ہمیں دھوکہ دینے کے لیے ہیں بلکہ دراصل ان لوگوں کو دھوکہ دیا جا رہا ہے جو سادہ لوح اور ناواقف حال ہیں اور اپنی اُمّت اور تاریخ پر سے اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہماری موجودہ نسل ان چالوں اور سازشوں کا شعور رکھے۔ اسے اپنے دین اور اپنے انسانی تہذیبی ورثے پر مکمل اعتماد ہو۔ یہ نسل ان مغربیوں کے سامنے اس طرح نہ جھکے جس طرح ذلیل غلام اپنے آقا کے سامنے جھکتا ہے اور صحیح و غلط مفید و مضر کی تمیز کے بغیر ان کے فکری سرمائے پر اس طرح نہ ٹوٹ پڑے جس طرح پروانہ آگ پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام سب سے بہتر مذہب' انسانی فطرت سے سب سے زیادہ قریب اور عوام کے مفاد کا سب سے زیادہ ضامن ہے اور تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام کی جنگیں سب سے زیادہ عادلانہ اور رحمدلانہ تھیں۔ ان میں پریشانیاں اور نقصانات کم اور فوائد زیادہ تھے اور مقصد پاکیزہ تھا اور ہر نیا دن اس بات پر ایک نئی دلیل لے کر طلوع ہوتا ہے کہ اسلام اللہ کا دین ہے اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور سچے مسلمان اللہ کے برگزیدہ بندے اور عوام الناس میں سب سے بہتر انسان ہیں:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝٥٣﴾

(سورۃ حٰمٓ السجدہ : ۵۳)

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ فرمان واقعی برحق ہے۔کیا یہ بات کافی نہیں کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے؟''

(۹)...... ہوازن کی شکست کے بعد ثقیف کے باقی ماندہ دستے طائف چلے آئے چنانچہ آپ ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا' لیکن وہ فتح نہ ہوا تو مدینہ واپس لوٹے۔راستے میں حنین کے مالِ غنیمت کو تقسیم فرمانا شروع کیا۔غلاموں اور باندیوں کی تعداد چھ ہزار تھی اور اونٹ بکری لا تعداد۔اشرافِ عرب کو تالیفِ قلب کے لیے زیادہ اور دل کھول کر عنایت کی اور سردارانِ قریش کو بھی بہت فیاضی کے ساتھ دیا' لیکن انصار کو کچھ بھی نہ دیا چنانچہ کچھ انصاری نوجوانوں میں اس تقسیم پر چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔۔ یہاں تک کہ کسی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم سے جا ملے ہیں' یعنی فتح مکہ کے بعد ہمیں اب بھول گئے۔رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر انصار کو اپنے احاطہ میں جمع کیا اور حمد وثنا کے بعد فرمایا:

''اے گروہِ انصار! یہ کیسی چہ میگوئیاں ہیں جو مجھ تک پہنچی ہیں کیا میں تمہارے پاس اس حال میں نہیں آیا تھا کہ تم سب گمراہ تھے، پھر میرے ذریعے اللہ نے تمہیں ہدایت نصیب فرمائی، تم غریب اور مفلس تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں میرے ذریعے دولت مند کیا، تم سب ایک دوسرے کے دُشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا؟''

سب نے جواب دیا:

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فضل و احسان سب سے زیادہ ہے۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

اے انصار! کیا تم اس سوال کا جواب نہ دو گے؟

انہوں نے کہا:

یا رسول اللہ ﷺ! ہم اس بات کا آپ ﷺ کو کیا جواب دے سکتے ہیں۔ سارا فضل و احسان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

"نہیں، اللہ کی قسم! اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو اور تم جو کچھ کہو گے سچ ہو گا اور میں اس کی تائید کروں گا کہ آپ ﷺ ہمارے پاس اس حال میں آئے کہ آپ ﷺ کو جھٹلایا جا چکا تھا، اس وقت ہم نے آپ ﷺ کی تصدیق کی اور آپ ﷺ کو سچا تسلیم کیا، سب نے آپ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، ہم نے آپ ﷺ کی مدد کی۔ آپ ﷺ کو لوگوں نے بے خانماں کر دیا تھا، ہم نے آپ ﷺ کو پناہ دی، آپ ﷺ کا ہاتھ خالی تھا ہم نے آپ ﷺ کے ساتھ ہمدردی اور آپ ﷺ کی تسلی وغم خواری کی۔

اے جماعتِ انصار! کیا دُنیا کی چندروز ظاہر رنگینی وشادابی کے لیے جو میں نے ان کی تالیفِ قلب کے لیے انہیں دی ہے تا کہ وہ اس کی وجہ سے ایمان لائیں اور تمہیں تمہارے اسلام کے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا، تمہارے دل میں میرے بارے میں کچھ خیال آتا ہے؟

اے جماعتِ انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ اپنے ساتھ بھیڑ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم اپنے خیموں میں اللہ کے رسول ﷺ کو ساتھ لے کر جاؤ۔ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! تم جس چیز کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو وہ لے کر جائیں گے۔ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا، اگر لوگ کسی اور راستے اور وادی میں چلتے اور انصار کسی دوسری وادی میں تو میں انصار ہی کی وادی میں چلتا، انصار تو شعار (استر) ہیں اور دوسرے لوگ دثار ہیں (یعنی وہ کپڑے جو جسم

کے اوپر ہوتے ہیں اور جسم سے مَس نہیں کرتے) اے اللہ !انصار پر رحم فرما،
انصار کی اولاد پر رحم فرما اور انصار کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔''
یہ سُن کر تمام لوگ رو پڑے اور ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہوگئیں اور پُکار اُٹھے:
''ہم اللہ کے رسول ﷺ کی تقسیم پر راضی اور خوش ہیں۔''[1]

یہاں چند مسائل پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے:

پہلی بات:

مالِ غنیمت کے مسئلہ کو اسلام میں نظامِ جنگ کے ایک جزء کی حیثیت سے دشمنانِ دین نے طعن و تشنیع کا ہدف بنا لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مالِ غنیمت کا حصول ہی وہ مادی محرک ہے جس کے پیشِ نظر مسلمان فوجی چستی و فعالیت کا مظاہرہ کرتے اور فدا کاری اور قربانی دیتے ہیں، اسی لیے مسلمان جنگ کے بعد فوراً مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑتے تھے جیسا کہ اس جنگ میں بھی ہوا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر انصاف پسند اس دعویٰ کو ٹھکرا دے گا کیونکہ اسلامی جنگوں کا اصل محرک معنوی ہوتا تھا جس میں حق کی اشاعت اور ظلم و عدوان کا خاتمہ پیشِ نظر ہوتا تھا۔اس حقیقت کو آیات و احادیث بصراحت پیش کرتی ہیں۔مقامِ حیرت ہے کہ انسان غنیمت کے حصول کے لیے چاہے وہ کتنی ہی بڑی ہو اپنی زندگی کیسے قربان کر دے گا اور اپنے خاندان کا مستقبل کیسے برباد کر دے گا؟ مادّی مغانم کی لالچ اُن خارق عاداتِ فتوحات اور کارناموں کا سبب کیسے بن سکتی ہے جو صدرِ اسلام میں مسلمان فوجیوں نے انجام دیئے اور اس سے وہ شاندار نتائج کیسے برآمد ہو سکتے ہیں جو رسولِ اکرم ﷺ کی زندگی میں اور رُوم و ایران کے خلاف جنگوں میں رُونما ہوئے۔ حالانکہ مسلمانوں کا مالِ غنیمت ان کی شکست کی

---

[1] صحيح بخاري: ٤٣٣٠، صحيح مسلم: ١٠٥٩، صحيح ابن حبان: ٧٢٧٨، فقه السيرة محمد الغزالي: ٣٩٥، مجمع الزوائد: ١٠/ ٣٢.

حالت میں لازماً دشمنوں کے ہاتھ جاتا۔ پھر یہ معاملہ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ ہر دو متحارب فریقین کے ساتھ یہی صورتِ حال پیش آتی ہے پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادّی منافع کے لالچ نے دشمنوں سے یہ عظیم کارنامے کیوں نہ انجام دلوائے جو مسلمان فوجوں سے رُونما ہوئے اور جو اسلامی جنگوں کا تابناک ترین پہلو ہیں؟؟

اسلامی جنگوں کے واقعات و حالات اس باطل خیال کی پُر زور تردید کرتے ہیں۔ بدر، اُحد، موتہ اور دوسری تمام جنگوں میں مسلم سورما شہادت اور جنّت کی نعمت کی امید کے ساتھ شریک ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک بدو نے جب شہداء کے لیے جنّت کی بشارت سُنی تو کھجور منہ سے نکال کر پھینک دی اور یہ کہتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑا کہ: ہوں، ہوں! میرے اور جنّت کے درمیان بس یہ کھجوریں حائل ہیں۔ اللہ کی قسم! یہ لمبی مسافت ہے، اتنا جینے کی تاب نہیں، اور لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔ [1] ایک صحابی جنگِ اُحد میں یہ کہتے ہوئے میدانِ کارزار میں گھس گئے کہ مجھے جنّت کی خوشبو احد پہاڑ کے اس طرف محسوس ہو رہی ہے۔ [2]

ایرانیوں سے جنگ کے موقع پر جب مسلم وفد کو رستم نے زر و جواہر دے کر واپس کرنا چاہا اور جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی تو اس وفد کے رہنما نے برجستہ کہا کہ اللہ کی قسم! ہم اس کی خاطر نہیں نکلے، ہم تو تمہیں بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لانا چاہتے ہیں، اگر تم اسے تسلیم کر لو تو ہم واپس چلے جائیں گے اور تمہارا یہ اقتدار اور سر زمین تمہارے پاس ہی رہے گی۔ ہم تم سے اس کی خاطر کشمکش نہیں کریں گے۔ کیا یہ اُس جماعت کا جواب ہو سکتا ہے جو مالِ غنیمت کے حصول کے لیے اور غلبہ و تمکّن کے لیے نکلی ہو؟

اگر اس باطل دعویٰ کی شہادت میں غزوۂ حنین کے بعد ہونے والی چہ میگوئی اور انصار کی خفگی کو پیش کیا جائے تو یہ صحیح نہ ہو گا۔ اس لیے کہ اس وقت مالِ غنیمت کے حریص وہ لوگ

---

[1] صحيح مسلم: ١٩٠١

[2] صحيح ابن حبان: ٤٧٧٢.

تھے جو ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئے تھے اور ان کے دلوں میں سابقون الاوّلون کی طرح ایمان و ہدایت راسخ نہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابو بکر، عمر، عثمان، علی، ابن عوف، طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم اور دوسرے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اس طرح کی کوئی خواہش نہ ابھری تھی اور بعض انصار کی چہ میگوئی اس بات پر تھی کہ بعض فوجیوں اور سپاہیوں کو تقسیم میں افضلیت دی جا رہی تھی اور یہ خدشہ ہر دور میں ہر جگہ عوام النّاس میں ہوتا ہے۔اس طرح کے حالات میں ہر انسان اپنے دل میں اس طرح کے خیالات محسوس کرتا ہے۔

انصار رضائے رب، ثواب اور جنّت کی خواہش رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ جب نبی ﷺ نے اپنی تقریر میں کہا کہ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ لوگ اُونٹ اور بکری لے کر واپس جائیں اور تم اللہ کے رسول ﷺ کو لے کر اپنے گھروں کو واپس جاؤ، تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ابل پڑیں۔جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور اس کی قربت کو مال و دولت پر ترجیح دی تھی کیا ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ انھوں نے صرف مال و متاعِ دنیا کے لیے جہاد کیا تھا؟

یہ اعتراض کرنا دُرست نہ ہوگا کہ اسلام نے مالِ غنیمت کو حکومت کی ملکیّت قرار دینے کے بجائے لڑنے والوں کی ملکیّت کیوں قرار دیا؟ یہ سوال عوام النّاس کے مزاج اور اُس دور میں جنگوں کی روایات سے نا واقفیّت کا نتیجہ ہے۔تنہا اسلامی فوج مالِ غنیمت کا ۴/۵ حصّہ اپنے افراد میں تقسیم نہ کرتی تھی بلکہ اس وقت کی ساری فوجیں اس اصول پر عمل پیرا تھیں۔اگر دورِ جدید کا کوئی مجتہد مالِ غنیمت کو فوج میں تقسیم کرنے کے بجائے حکومت کی ملکیّت کا فتویٰ دے تو یہ اسلامی اصولوں اور اس کی رُوح کے خلاف نہ ہوگا۔

دوسری بات:

جدید العہد مسلمانوں کو بڑی فیّاضی کے ساتھ نوازنا رسولِ اکرم ﷺ کی حکمتِ عملی، اپنی قوم کی نبض شناسی اور معاملات کے انتظام میں آپ ﷺ کی دُور اندیشی پر دلالت کرتا

ہے۔ یہ لوگ فتح مکّہ تک رسول اللہ ﷺ کے خلاف لڑتے آئے تھے اور آپ ﷺ کی دعوت کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہے تھے اور معرکۂ حنین کے آغاز میں بھی مسلمانوں کی شکست سے خوشی کے شادیانے بجائے تھے' ان کی تالیفِ قلب کے لیے ضروری تھا کہ انہیں بیش ار مبیش نوازا جائے اور اس ناز ونعمت سے وافر حصہ دیا جائے جس کی خاطر یہ اب تک جنگ میں حصّہ لیتے آئے تھے، کیونکہ یہ اشراف قوم محض اپنی سرداری بچانے اور اپنے مفادات کی حفاظت کی خاطر جنگ کر رہے تھے۔ جب اسلام نے ان کی قوّت وشوکت کو توڑ دیا اور مکّہ فتح ہو گیا تو یہ عین ممکن تھا کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں اس فتح کے خلاف نفرت موجود رہی ہو اور اپنی ہزیمت اور ہار پر پیچ وتاب کھاتے رہے ہوں ۔چونکہ اسلام ہدایت اور اصلاح کا دین ہے، اس لیے قہر وغلبہ کے ذریعے اقتدار کے حصول کو کافی نہیں سمجھتا جیسا کہ دوسری نظریات اور تحریکات عوام کے دلوں اور دماغوں پر دستک دینے کے محض قوت کو اپنی بقا اور قیام کے لیے ضروری سمجھتی ہیں بلکہ دلوں کے دروازے بھی کھولتا ہے۔ انسان کی ہدایت کی فکر بھی کرتا ہے اور اپنے اصولوں اور اقدار سے میں اطاعت ومحبت بھی پیدا کرتا ہے ۔چنانچہ جب تک کچھ لوگوں کے قلوب کی اصلاح میں عطیات اور نوازشات مفید ثابت ہوں ،تمام تر حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ انہیں نوازش کی جائے تا آنکہ خوش ہو جائیں جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کہا۔

اللہ کو معلوم تھا کہ یہ دعوت جسے جزیرۂ عرب میں کامیابی ملی ہے ،دُنیا کے مشرق ومغرب میں اسے پھیلنا ہے اس لیے تمام عروبوں کو اس پیغام کی اشاعت کے لیے اور اس کی راہ میں قربانی دینے کے لیے تیار کرنا ہے،ضروری ہے تا کہ جب ان اشراف کے دل عطیات سے مطمئن ہو جائیں تو دعوت کی روشنی کے لیے وہ اپنے دروازے کھول دیں اور اس پیغام کی تبلیغ واشاعت کے لیے اپنے کو وقف کر دیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔جب اللہ کے رسول نے ان سرداروں کی عطیات سے تالیف قلب کر دی تو اسلام اور اس کی دعوت کے خلاف تمام نفرت

ان کے دل سے ڈھل گئی اور جب اسلامی فوج پوری روئے زمین پر اسلام کی بشارت سُنانے اور لوگوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر نورِ حق میں لے جانے کے لیے پھیلی تو جزیرۂ عرب اس عظیم تاریخی کام کے لیے تیار تھا۔ پھر یہی مؤلّفۃ القلوب رؤسا اور اشراف تھے جنھوں نے اس معرکہ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور تاریخ میں ان کے شاندار کارنامے ریکارڈ ہیں۔ جزیرۂ عرب سے باہر اسلام کی حکومت کو استحکام عطا کرنے میں بھی ان کا بڑا رول رہا ہے اور مملکت کی توسیع وحفاظت اور فوجوں کی قیادت و رہنمائی میں بھی یہ پیش پیش رہے ہیں۔

ان مجاہدین کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچا کہ وہ اپنے آغازِ اسلام میں مؤلّفۃ القلوب میں سے تھے یا فتح مکّہ کے بعد یہ داخل ہوئے تھے، اس لیے کہ بسا اوقات پیچھے والا آگے والے کو جا لیتا ہے اور کمزور طاقتور کی جگہ سنبھال لیتا ہے اور آغاز میں اخلاصِ عمل نہ تھا تو بعد میں اخلاص آ جاتا۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے کہ ”ہم نے یہ علم رضائے الٰہی کے لیے حاصل نہیں کیا، لیکن وہ لگے رہے یہاں تک کہ مقصد پاکیزہ ہو گیا“۔ کسی دوسرے نے کہا ہے کہ ”جب ہم نے علم حاصل کیا تو کوئی نیّت نہ تھی، پھر بعد میں نیّت شامل ہو گئی۔ بعد میں اسلام قبول کرنے والوں کے اطمینان کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اللہ نے ان سے اچھے اجر کا وعدہ کیا ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١٠﴾﴾ (سورة الحديد: ١٠)

”تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی اُن کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ اُن کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے۔ اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھّے وعدے فرمائے ہیں، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

تیسری بات:

رسول اللہ ﷺ کا انصار کو جمع کرنا اور انہیں راضی کرنا آپ ﷺ کے حُسنِ سیاست کی دلیل ہے۔جب آپ ﷺ کو چہ میگوئیاں معلوم ہوئیں تو آپ ﷺ نے انہیں ایک احاطہ میں جمع کیا اور اپنی حکیمانہ تقریر سے راضی کر لیا حالانکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ یہ انصاری آپ سے محبت کرتے اور آپ ہی کی اطاعت کرتے ہیں، انہوں نے اس راہ میں جان و مال کی بازیاں لگائی تھیں، اس لیے ان کے ایمان میں کمی پیدا ہونے یا ان کے غضبِ الٰہی میں مبتلا ہونے کا خدشہ نہ تھا، لیکن آپ ﷺ نے پسند فرمایا کہ اس موضوع سے متعلق جو کھٹک ذہنوں میں پیدا ہوگئی ہے اسے دور کر دیا جائے ۔یہ ایک پیاری اور محبوب سنّت ہے جسے رہبروں اور رہنماؤں کو اپنے اعوان و انصار کے ساتھ برتنا چاہئے۔اس لیے کہ دشمن ہر اس واقعہ یا گھات میں لگے رہتے ہیں جو پیروکاروں کی اپنے قائد سے محبت میں کمی کر دے اور شیطان بڑا چالباز' مکار اور فتنہ پرداز ہے اس لیے قائدین کو اپنے اعوان و انصار کو راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے چاہے انہیں قائدین پر کتنا ہی اعتماد ہو۔

پھر وہ حکیمانہ موثر اسلوب دیکھیئے جسے اللہ کے رسول ﷺ نے انسان کو راضی اور مطمئن کرنے کے لیے اختیار کیا۔ پہلے تو دعوتِ دین میں ان کی فضیلت ،رسول ﷺ کی نصرت اور اپ ﷺ کی تصدیق وتائید میں ان کی مسابقت کا ذکر کیا اور یہ کہ اللہ نے اپنے فضل واحسان سے انہیں ضلالت ،باہم دُشمنی اور بدبختی سے نکالا تا کہ جومتاعِ حیات اور مال ومنال آج ان کونہیں مل سکا ہے اس کے مقابلہ میں میسّر ہونے والی سعادت اور ہدایت کی قدر وقیمت اجاگر ہوسکے ۔پھر آپ ﷺ نے دو چیزوں پر زور دیا،ایک یہ کہ اپنی قوم میں نہیں جا گھسے اور انصار کو فراموش نہیں کر دیا جیسا کہ بعض کے دل میں آ گیا تھا،دوسرے یہ کہ مالِ غنیمت سے انہیں محروم اس لیے رکھا کہ ان کے دین کی مضبوطی،ان کے ایمان کے استحکام اور محبتِ الٰہی وحبِ رسول ﷺ پر کامل اعتماد تھا۔اللہ کی قسم!دعوت کے میدان سبقت کرنے

والوں اور مؤمنین مخلصین کو راضی کرنے کا اس سے بہتر اسلوب اور کوئی نہیں ہوسکتا، کتنی سچی بات کہی ہے قرآن نے:

﴿وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ (سورة القلم: ٥)

''اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔''

چوتھی بات:

نبیٔ اکرم ﷺ کا وعظ سننے کے بعد جو موقف اختیار کیا وہ صداقتِ ایمانی، رقتِ قلب اور ہدایت وتقویٰ میں اللہ کے فضل واحسان کے شکرانے کی بہترین مثال ہے۔ انہیں یاد آ گیا کہ آج جو فتح ونصرت انہیں حاصل ہوئی ہے وہ محض اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فضل ہے۔ اگر اللہ نے نہ چاہا ہوتا تو ہدایت کبھی نہ ملتی، رسول ﷺ نہ ہوتا تو ان کے قلوب وضمائر کبھی روشن نہ ہوتے اور اسلام نہ ہوتا تو پراگندگی کے بعد یہ کبھی متحد اور مجتمع نہ ہو پاتے، ان کی جان و مال محفوظ نہ ہوتی، انہیں پنجۂ یہود سے رستگاری نصیب نہ ہوتی اور پڑوسی سامراجوں سے گلوخلاصی ممکن نہ ہوتی۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ سارے مال ومنال پر ہم رسول اللہ ﷺ کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور جب اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے لیے اور ان کے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے رحمت کی دُعا کی تو رسول اللہ ﷺ کی عنایت وتوجّہ کو دیکھ کر ان کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ بھلا صداقتِ ایمانی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا چاہیے؟ اور کیا اس محبت سے پاکیزہ اور بلند تر محبت کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور انہیں راضی رکھے۔ سارے جہاں میں ان کا ذکر ہمیشہ قائم رکھے اور ہمیں ان سے جنّتِ نعیم میں ملائے اور تمام صدیقین، شہداء اور مقرب بندوں کی صحبت اور معیّت نصیب کرے آمین؛

انصار اور رسول اللہ ﷺ کے مابین ان رویوں اور مواقف کو ہر داعیٔ دین کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور ہر طالبِ علم کو انہیں محفوظ کر لینا چاہیے کیونکہ اس سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت وشوق کی چنگاری اور بھڑک اُٹھتی ہے۔

بُتوں کا استیصال

ابراہیم علیہ السلام جو نوح علیہ السلام کے بعد ابو الانبیاء کہے جاتے ہیں، انہوں نے اپنی قوم میں بُت پرستی کے خلاف جنگ کی تھی یہاں تک کہ قوم نے انہیں آگ میں ڈالنے کی کوشش کی جیسا کہ قرآن کریم کا بیان ہے۔ پھر جب آپ علیہ السلام مکّہ آئے تو اپنے لختِ جگر اسماعیل کو ان کی والدہ کے ساتھ یہیں چھوڑ دیا۔ جب اسماعیل علیہ السلام بڑے ہوئے تو دونوں نے مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تا کہ وہاں اللہ کی عبادت کی جا سکے اور لوگ اس کا حج کریں ۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کی اولاد پھیلی۔ جو تاریخ میں عرب المستعربہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ لوگ اس وقت تک بتوں اور پتھروں کی پرستش سے نا آشنا تھے۔ پھر ان کے اندر ایک روایت چل پڑی کہ جب کوئی مکہ سے کہیں سفر کرتا تو حرم کا کوئی پتھر تو تعظیماً اپنے ساتھ لے لیتا اور جہاں کہیں بھی وہ قیام کرتا اسے احترام سے رکھتا اور خانہ کعبہ کی طرح اس کا طواف کرتا تا کہ برکت حاصل ہو اور حرم سے محبت و شوق کا اظہار بھی ہو۔ پھر عمرو بن لحی خزاعی کا دور آیا اور اس نے بُتوں کی عبادت مذہب میں داخل کر دی۔ یہ نبوت سے پانچ صدی پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ شخص قبیلہ جُرہُم کی مکہ سے جلا وطنی کے بعد خانہ کعبہ کی حجابت اور دربانی کا ذمہ دار بن گیا ۔ پھر ایک بار شدید بیماری میں مبتلا ہوا تو لوگوں نے کہا شام جاؤ، وہاں ٹھیک ہو جاؤ گے۔ وہاں جا کر یہ واقعی شفا یاب ہو گیا۔ اس نے وہاں کے لوگوں کو بتوں کو پوجتے دیکھا تو اس بابت ان سے دریافت کیا۔ انہوں نے کہا: ہم ان سے پانی اور بارش طلب کرتے ہیں اور فتح و غلبہ کی دعا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات اس کو پسند آئی اور کچھ بت وہاں سے مانگ کر مکہ میں نصب کر دیئے اور لوگوں کو اس کی تعظیم اور پرستش کا حکم دیا۔ اس طرح جزیرہ عرب میں بت پرستی پھیلی یہاں تک کہ مکّہ کے ہر گھر میں بُت کی پوجا ہونے لگی۔ سفر پر جاتے وقت آخری کام یہ ہوتا کہ ان بتوں کو عقیدت سے چھوتے اسی طرح سفر سے واپسی پر سب سے پہلے

گھروں میں ان کے سامنے حاضری دیتے۔

اس کے بعد عرب بتوں کی عبادت کے شوقین ہو گئے۔کسی نے باقاعدہ گھر تعمیر کر لیا، کسی نے بُت تراشا اور جو ان دونوں پر قادر نہ تھا اس نے حرم کے سامنے پتھر نصب کر دیا اور بیت اللہ کی طرح اس کا طواف ہونے لگا۔حالت یہ ہوگئی کہ سفر میں نکلتے تو جہاں قیام کرتے' چار پتھر اٹھا لیتے ان میں سے جو خوبصورت ہوتا اسے رب بنا لیتے اور بقیہ تین پتھروں کو چولہا بنانے میں استعمال کر لیتے اور جب وہاں سے کوچ کرتے تو اسے چھوڑ دیتے اور کہیں دوسری جگہ پڑاوَ ڈالتے تو وہاں بھی یہی روش اپناتے۔ [1]

تین بُت اُن کے سامنے زیادہ قابلِ تعظیم سمجھے جاتے تھے۔ان کا حج کیا جاتا اور ان کی خاطر ذبیحہ کیا جاتا۔ان میں سب سے مشہور منات تھا۔اس کا استھان مکہ اور مدینہ کے درمیان بحرِ احمر کے کنارے قُدید کے مقام پر تھا۔ویسے تو تمام عرب اس کی تعظیم کرتے تھے' لیکن اوس اور خزرج ان میں سب سے آگے تھے۔جب ۸ھ کو فتح مکہ کے لیے نبی ﷺ نکلے تو علی رضی اللہ عنہ کو اسے ڈھا دینے کے لیے بھیجا۔چنانچہ انہوں نے جا کر اسے منہدم کر دیا اور جو کچھ وہاں میسّر آیا لا کر نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ چنانچہ اس میں دو تلواریں بھی تھیں جو شاہ غسّان حارث بن ابی شمر غسانی نے اس بت کو ہدیہ کی تھیں۔ یہ حارث وہی شخص ہے جس نے رسولِ اکرم ﷺ کے سفیر شجاع بن وہب الاسدی رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا تھا۔

دوسرا بُت لات تھا۔اس کا استھان طائف میں تھا۔یہ ایک چوکور پتھر تھا۔قریش اور تمام عرب اس کی تعظیم کرتے تھے۔فتح مکّہ سے واپسی کے بعد جب ثقیف کا وفد نبیٔ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس بُت کو تین سال تک چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا اور درخواست کی کہ اسے منہدم نہ کیا جائے تو آپ ﷺ نے سختی سے منع کر دیا۔پھر وہ برابر ایک سال گھٹاتے رہے اور آپ ﷺ اپنے فیصلے پر اڑے رہے یہاں تک کہ صرف ایک مہینہ کی مہلت مانگی تو

[1] الاصنام ازکلبی؛ص۳۳۔

بھی آپ ﷺ نے انکار کر دیا۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ ان کا منشا بظاہر یہ تھا اس بت کو ابھی نہ ڈھایا جائے تاکہ کم عقل لوگوں، عورتوں اور بچوں کو تیار کر لیا جائے۔ وہ یہ پسند نہ کرتے تھے اس بت کو ڈھا کر قوم میں سراسیمگی اور خوف و ہراس پیدا ہو اور وہ ڈر کر اسلام قبول کریں۔ لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا اور ابوسفیان بن حرب اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کو بھیجا اور ان دونوں نے اسے ڈھا دیا۔ جب مغیرہ رضی اللہ عنہ بُت پر کدال چلانے لگے تو ثقیف کی عورتیں واویلا کرتی ہوئی نکل پڑیں، وہ کہہ رہی تھیں:

لَتُبْـلَـيَّـنْ دُفَّـاع

اَسْـلَـمَـهَـا الوُضّـاع

لَمْ يُحينو المِصَاع [1]

''ہائے افسوس'' وہ نہ رہی جو ہمارے دشمنوں کو ہم سے مار بھگاتی تھیں، ہم سے مصیبتوں کو ٹالتی تھی، کمینوں نے اسے ڈھانے کے لیے بے یارو مددگار چھوڑ دیا۔ اس کی مدافعت نہ کی اور اس کی راہ میں میان سے تلواریں نہ نکالیں۔''

تیسرا بُت عُزّیٰ تھا۔ مکّہ سے عراق کو سفر کرنے والے کے دائیں طرف اس کا استھان پڑتا تھا۔ خاص طور پہ قریش اس کی پوجا کرتے تھے۔ جب قرآن نے اس پر اور دوسرے بُتوں پر چوٹ کی تو قریش کو سخت ناگواری محسوس ہوئی۔ اور جب اَبُو اُحیحہ یعنی سعید بن عاص بن اُمیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بستر مرگ پر تھا۔ ابولہب اس کی عیادت کے لیے آیا۔ دیکھا تو رو رہا ہے پوچھا: ''کیا بات ہے اَبُو اُحیحہ! کیا موت سے ڈر کر رو رہے ہو، حالانکہ وہ تو سب کو آنی ہے؟ اَبُو اُحیحہ نے کہا: نہیں، البتہ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بعد عُزّیٰ کی پوجا کیسے ہوگی! ابولہب نے کہا: اللہ کی قسم! تمہاری زندگی میں نہ تمہاری خاطر عُزّیٰ کی

[1] سیرتِ ابن ہشام۔

پوجا ہوتی تھی نہ تمہارے بعد، اسے یکہ وتنہا چھوڑ اجائے گا۔ اَبُواُحیحہ نے کہا: اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ میرا کوئی جانشین موجود ہے۔ [1]

جب مکّہ فتح ہوا تو نبی ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اسے گرانے کا حکم دیا۔ چنانچہ جب خالد رضی اللہ عنہ اس کے پاس پہنچے تو اس کے پروہت دبیہ بن حرمی شیبانی نے دو اشعار کہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اے عُزّیٰ، آج تو طاقت وقوّت کا ہمالہ بن جا اور خالد (رضی اللہ عنہ) پر جھوٹی ثابت نہ ہو جس نے دو پٹہ اوڑھ لیا ہے، اگر آج تو نے خالد (رضی اللہ عنہ) کو قتل نہ کیا تو جلد ہی ذلیل ہو جائے گی اور تیرا دین بدل جائے گا۔''

اس کے جواب میں خالد رضی اللہ عنہ نے یہ شعر کہا:

''اے عُزّیٰ، ہم تیرا انکار کرتے ہیں، تجھے بخش نہیں سکتے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ نے تجھے رُسوا کر دیا ہے۔''

لوگ کہتے ہیں کہ اس کا استھان ایک درخت کے اندر تھا۔ جشبہ کی شکل میں تھی، بال دُھنی ہوئی روئی کی طرح تھے، ہاتھ کندھے پر رکھے ہوئے تھے۔ جب خالد رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو کاٹ دیا تو یہ شکل اُن کے سامنے آئی چنانچہ سر پر کلہاڑا مار کر اسے پاش پاش کر دیا تو دیکھا کہ کالے رنگ کا پتھر تھا۔ وہاں سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ کو آپ رضی اللہ عنہ نے خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''یہی عُزّیٰ تھی اور اب عربوں کے لیے کوئی عُزّیٰ نہیں رہے گی۔ آج کے بعد اس کی عبادت کبھی نہ کی جائے گی۔''

یہ جاہلیّت کے مشہور ترین بُت تھے جن کا خود قرآن نے ذکر کیا ہے:

---

[1] الاصنام از کلبی؛ ص۳۳۔

﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝١٩ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝٢٠ ﴾

(سورة النجم: ١٩تا ٢٠)

''تم نے کبھی اِس لات اور اِس عُزّیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے؟''

فتح مکّہ کے دن جب رسول اللہ ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے تو فرشتوں وغیرہ کی شبیہیں دیکھیں۔ابراہیم علیہ السلام کی شبیہ دیکھی کہ ہاتھوں میں تیر لیے فال نکال رہے ہیں تو فرمایا: ''ان کا بُرا ہو، ہمارے دادا ابراہیم علیہ السلام سے فال نکلوا رہے ہیں، بھلا ابراہیم علیہ السلام کا اس سے کیا تعلق؟''

﴿ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝٦٧ ﴾ (سورة آل عمران: ٦٧)

''ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

پھر ان تمام شبیہوں کو مٹانے کا حکم دیا گیا اور سب کُھرچ کر پھینک دی گئیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکّہ کے دن اپنی سواری پر مکّہ میں داخل ہوئے۔بیت اللہ کا طواف کیا، اس وقت آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک کمان تھی، آپ ﷺ اس سے ان بتوں کو چوکے مارتے اور فرماتے تھے:

﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝٨١ ﴾

(سورة بنی اسرائیل: ٨١)

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔''

اسی کے ساتھ تمام بُت ایک ایک کر کے منہ کے بل گرتے جاتے تھے۔یہاں تک کہ خانہ کعبہ میں کوئی بت سلامت نہ رہا۔

فتحِ مکّہ کو چند مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ جزیرۂ عرب کے تمام بُت اوندھے منہ گر گئے۔ان کے پوجنے والوں نے ان کا انکار کر دیا اور اب اپنی ماضی کی حرکتوں پر پشیمان رہنے لگے کیونکہ وہ ایسے پتھر کی پرستش کرتے تھے جو نفع پہنچا سکتا تھا نہ نقصان اور نہ حوادثِ زمانہ سے بچا سکتا تھا۔

اسلام کے پیغام نے اوّل روز سے ہی ان بُتوں کی توہین وتحقیر اور ان کے پجاریوں پر لعنت ملامت شروع کر رکھی تھی اور انہیں دینِ فطرت کی دعوت دے رہا تھا اور پورا جزیرۂ عرب، جس میں قریش سب سے آگے تھے، اس دعوت کو بڑی حیرت اور تعجب کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا:

﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝﴾ (سورۃ ص: ۵)

''کیا اس نے سارے معبودوں کی جگہ بس ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔''

جزیرۂ عرب بھڑک اُٹھا۔اس نئے دین سے پریشان ہو گیا اور ہر ممکن ہتھیار استعمال کر کے اس دعوت اور اس کے رسول ﷺ کا کام تمام کرنے کی کوشش کی لیکن اِکّیس سال کی جاں گسل کشمکش کے بعد آخر کار فتح رسولِ اکرم ﷺ کو نصیب ہوئی چنانچہ آپ ﷺ نے بُت پرستی کے اس مرکز کا افتتاح بُتوں کے استیصال سے کیا۔اس کے پجاریوں کو شکستِ فاش ہوئی، لیڈرانِ قوم کی سازشیں دھری کی دھری رہ گئیں۔کیا عقل یہ تسلیم کرتی ہے کہ اس مختصر مدّت میں اتنا بڑا انقلاب آ جاتا جبکہ ابتداء میں کوئی انسان آپ ﷺ کا ہمنوا نہ تھا، اگر اللہ کی نصرت شاملِ حال نہ ہوتی، وہ اپنے دستوں سے مدد نہ فرماتا اور تمام معرکوں میں رہنمائی نہ کرتا؟

﴿وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی ۚ﴾ (سورۃ الانفال: ۱۷)

''اور جب پھینکا تو تُو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔''

حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ نے عرب کو اس فکری اضمحلال اور پستی سے نکالا، جس میں وہ صدیوں سے مبتلا تھے اور عربی عقل کو بُت پرستی کی بیڑیوں سے آزاد کرایا، وثنیت کی ذلّت و رسوائی سے عربی شرافت کو نجات دلوائی اور عرب کو خلود اور ہمیشگی کی زندگی عطا کی جس سے وہ محروم نہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے کتنی سچی بات کہی تھی: ''اب عرب کے لیے کوئی عُزّیٰ نہیں ہوگی، آج کے بعد کبھی اس کی پوجا نہ کی جائے گی۔''

جزیرۂ عرب نے ہمیشہ کے لیے بُت پرستی کو خیر آباد کہہ دیا۔ عربی عقل سنّ رشد کو پہنچنے کے بعد پھر طفولیت کی طرف واپسی نہ ہوئی، جہاں انسان کو اپنی پیشانی گونگے بہرے پتھروں کے سامنے جُھکانا پڑتی تھا ۔ رسولِ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد مختلف فتنے اُٹھے۔ مدعیانِ نبوّت نے شورش برپا کی ،قرآن کے مخالفین نے الگ محاذ بنایا ،لیکن ہم نے کبھی نہیں سُنا کہ کسی عربی نے بُت پرستی کی طرف لوٹنے کی فکر کی ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بالغ شخص بچپنے کو لوٹنا پسند نہیں کرتا اور یہ سب محض حضرت محمد ﷺ کے خلوص واحسان اور آپ ﷺ کی رسالت کے فیضان کا اثر ہے ۔قیامت تک کے لیے ہر عربی پر آپ ﷺ کا یہ احسان ہے کہ اسے آزادی عطا کی۔ پھر دُنیا کی دوسری قوموں پر بھی آپ ﷺ کا احسان و اکرام یہ ہے کہ انہیں ہدایت کی راہ دکھائی، اب جو چاہے صراط مستقیم پر چلے اور جو چاہے اس سے اعراض کرے۔

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴾

(سورة الجمعة : ٢)

''وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سُناتا ہے ،ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ کُھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔''

غزوۂ تبوک کے اہم عبرت آموز نکات

(۱)...... اس غزوہ کا محرک یہ تھا کہ رُوم نے شام میں اپنی فوجیں جمع کیں اور ہرقل نے اپنے فوجیوں کی ایک سال کی خوراک کا انتظام کیا اور ان کے ساتھ لخم، جذام، عاملہ، غسّان اور عرب کے دوسرے قبائل جا ملے اور ان کے دستے بلقاء تک جا پہنچے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے روانگی کا حکم دیا۔ عوام النّاس کو تیاری اور جنگ کے لیے استعدادِ کامل بہم پہنچانے کی دعوت دی اور اغنیاء کو بذل و انفاق پر اُبھارا۔ [1]

اس سے ہمارے سامنے اسلام کا جنگی مزاج اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ اس کا مقصد ظلم و استبداد ہوتا ہے نہ کالونیوں کی آبادکاری۔ بلکہ دین و وطن کے دفاع، ظالموں کے توڑ اور ظلم و فساد کے استیصال کے لیے جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی بیشتر آیات اس کی صراحت کرتی ہیں۔ ہم پیچھے جنگِ اسلامی کے جواز، اسباب اور اہداف و مقاصد پر گفتگو کر آئے ہیں۔ اور یہاں بھی جب رُومیوں نے اپنی فوجیں جمع کر لیں تب آپ ﷺ نے خروج کیا۔ اس سے بھی اس اصول کی تائید ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کے خلاف بعض عربی قبائل کا رومیوں سے مل جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسلام اور اس کے پیغامِ آزادی کی حقیقت سے ناآشنا تھے۔ اگر اس سے وہ واقف ہوتے تو اپنے عرب بھائیوں کے خلاف رومیوں کے دست بازو نہ بنتے۔

(۲)...... رسول اللہ ﷺ نے جس وقت روانگی کا حکم دیا، سخت گرمی اور دھوپ کا موسم تھا اور کھجوریں پک چکی تھیں اور ان کے اتارنے کا وقت قریب آ لگا تھا۔ چنانچہ مخلص اور راست باز مسلمان ان دشواریوں اور خساروں کی پرواہ کیے بغیر میدان میں نکل پڑے۔ لیکن منافقین پیچھے رہ گئے اور مختلف قسم کے بہانے تراش کر گھروں میں بیٹھ رہے۔ اسی طرح

[1] اس غزوہ کی تفصیل کیلئے دیکھیے: سیرت ابن ہشام: ۴/۱۱۸-۱۵۱، نیز زیرِ نظر کتاب؛ ص۱۰۰ تا ۱۰۲

سختیوں کے اوقات میں منافق اور مخلص چھٹ جاتے ہیں اور آزمائش کے دور میں جھوٹے مدعیوں کا پول کھل جاتا ہے قرآن کا فرمان ہے:

﴿الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ (سورۃ العنکبوت:۱ تا ۳)

''ا،ل،م کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ،،ہم ایمان لائے ؛؛اور ان کو آزمایانہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جوان سے پہلے گزر چکے ہیں۔اللہ کوتو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔''

دعوتیں اور تحریکیں اوپر اس وقت اُٹھتی ہیں جب منافقوں اور مکّاروں سے ان کی صفیں پاک ہو جاتی ہیں۔اور شدائد میں ثابت وہی رہتا ہے جو عزمِ محکم کا مالک ہو،مخلص اور راست باز ہو،اور اُصولوں سے اسے لگاؤ اور محبت ہو۔بارہا کمزور ایمان والے اور دھوکے بازوں نے اصلاحی دعوتوں کی راہ بند کی اور نصرت وفتح کی راہ میں روڑے اٹکائے یا اسے مؤخر کرنے کا سبب بنے۔غزوۂ تبوک میں مسلمانوں کا گروہ منافقوں سے پاک وصاف ہوگیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ فوج جو سیسہ پلائی دیوار ہو، ایمان ویقین میں محکم ہو،عہد وپیمان میں راست باز ہو وہ اُمّت کے لیے زیادہ نفع بخش ثابت ہوتی ہے اور نصرت وفتح سے ہمکنار ہوجاتی ہے چاہے تعداد میں معمولی ہو، اس کے برعکس جو فوج کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود شکست کھا جاتی ہے وہ دراصل قوت وثبات ،اتحاد واتفاق اور عزم ویقین کی صلاحیتوں سے محرم ہو جاتی ہے:

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ (سورۃ البقرہ :۲۴۹)

''بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا، اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔''

(۳)...... ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم وغیرہ اغنیاء صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا بذل وانفاق میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور ایک دوسرے سے مقابلہ ومسابقت کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایمان جب دلوں میں راسخ ہو جاتا ہے تو خیر اور معروف کے لیے سبقت لے جانے کی تمنّا پرورش پاتی ہے اور نفس کی سفلی طبیعتوں کو کچل دیا جاتا ہے۔ اور یہ دشمنوں پر فتح وغلبہ کے حصول کے لیے ہر دعوت کے لیے لازمی اور ضروری صفات ہیں۔ آج ہماری اُمّت ان صفات کی سب سے زیادہ محتاج ہے، اس لیے کہ دُشمنوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ ذمّہ داریاں بہت بڑھ چکی ہیں، معرکہ نہایت خوفناک ہے اور دُشمن حد سے زیادہ چالاک اور مکّار ہے۔ ہم اس پر غلبہ اسی وقت پا سکتے ہیں جب جان و مال، خواہشات اور شہوات کی بیش از بیش قربانیاں دیں۔ اور یہ جذبہ اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب دین کی اصل حقیقت کو ہم سمجھیں جو نفوس کا تزکیہ اس ڈھنگ سے کرتا ہے کہ اللہ کی راہ میں دوڑ و دھوپ اور انفاق و ایثار کو جہاد قرار دیتا ہے جس پر اسی طرح اجر عظیم ملتا ہے جس طرح میدانِ جہاد میں لڑنے والوں کو۔

مصلحینِ اُمّت اور رہنمایانِ انقلاب کے کرنے کا کام یہ ہے کہ عوام النّاس کے دلوں میں دین کی شاندار تخم ریزی کریں، اسے نشو وارتقاء دیں، دین سے مقابلہ کرنے یا اس سے آزادی حاصل کرنے یا اس کا مذاق اُڑانے کی ہر کوشش وطنی وملکی جرم ہے، جس کے بدترین نتائج نکل سکتے ہیں۔ ہمیں اللہ نے اسی بات کی تعلیم دی ہے اور ماضی کی تاریخ اور حاضر کے تجربات ہمیں یہی بتاتے ہیں۔ اس حقیقت کا انکار محض ایک مغالطہ ہے جس میں وہی لوگ مبتلا ہو سکتے ہیں جن کے دل حق کے لیے خالص نہ ہوں، جن کے قلوب حق کے لیے وانہ ہوئے ہوں اور جن کے مزاج پاکیزگی اور شرافت کے

متحمّل نہ ہو سکے ہوں۔

(۴)...... کچھ لوگ اس موقعہ پر اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں جہاد میں شریک کیا جائے، لیکن آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سواریاں نہ ہونے کی وجہ سے معذرت کر دیتے ہیں تو اُن کی آنکھوں میں درد و کرب اور محرومی کی وجہ سے آنسو چھلک اُٹھتے ہیں۔ ان کا ذِکر قرآن نے بھی کیا ہے۔ [1] یہ ایک بہترین مثال ہے کہ سچّا ایمان کس طرح کے معجزات بروئے کار لاتا ہے۔ عام انسانوں کی فطرت تو یہ ہوتی ہے کہ خطرات سے نجات پا کر اور جنگوں سے دُور رہ کر خوشی محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ سچّے اور مخلص مسلمان اس محرومی سے رو پڑتے ہیں، اس لیے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ثواب اور جنّت کی نعمت کے حصول کا ایک نادر اور قیمتی موقع ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ ایمان کے سوا اور کون سا محرک دلوں میں یہ جذبہ پیدا کر سکتا ہے؟ اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو گا کہ اُمت ایسے لوگوں کے وجود سے محروم ہے؟

(۵)...... کچھ مخلص مسلمان [2] جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے۔۔ تکان پر راحت کو، گرمی پر سایہ کو اور سفر پر اقامت کو ترجیح دینے (محض سُستی) کی وجہ سے جنگ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کے ساتھ جو سلوک ہوا اس میں اجتماعی نصیحت اور درس ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ان کا ایمان بیدار ہو گیا اور انہیں احساس ہو گیا کہ پیچھے رہ کر انہوں نے زبردست غلطی کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود سزا سے انہیں مستثنیٰ نہیں سمجھا گیا۔ ان کی سزا نہایت سخت اور دردناک تھی۔ انہیں پوری سوسائٹی سے الگ تھلگ کر دیا گیا۔ تمام لوگوں کو حتیٰ کہ ان کی بیویوں کو بھی ان سے بات کرنے روک دیا گیا، اور جب اللہ کو ان کے اخلاص اور توبہ کا یقین ہو گیا اور ان کی ندامت وحسرت اور افسوس و پشیمانی انتہا کو پہنچ گئی

---

[1] دیکھیے سورۃ التوبہ، آیت: ۹۲۔

[2] ان کا تین ہونا تو سورۃ التوبہ، آیت: ۱۱۸ میں آیا ہے اور وہ تھے: حضرت کعب ابن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم۔

تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کی اور انہیں جب اس کی بشارت سُنائی گئی تو ان کی خوشی بے حد وحساب تھی حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے اپنی دولت اور اپنے کپڑے اتار کر صدقہ کر دیئے کہ اللہ کا شکریہ ادا کرے۔

یہ واقعہ ایک مومن مخلص کو متنبہ کرتا ہے کہ ایسے عمل سے جی نہ چرائے جس کا واجبات تقاضا کرتی ہوں وہ اپنے لیے راحت کو پسند نہ کرے، جبکہ عوام تھکن سے چور ہوں، لوگ بدحال ہوں تو وہ فارغ البالی میں مست نہ رہے کہ ایمان کا مزاج یہی ہے۔ آپ کو ہمیشہ اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ آپ جماعت کے ایک فرد اور اکائی ہیں اور یہ کہ جماعت کے لیے جو چیز نقصان دہ ہے وہ آپ کے لیے بھی ہے اور جو اس کے لیے مفید ہے وہ آپ کے لیے بھی ہے۔ اگر اُمت بدحالی اور مفلسی میں مبتلا ہو تو آپ کی خوشحالی بے کار ہے۔ لوگ زحمتوں اور پریشانیوں کا شکار ہوں تو آپ کی راحت بے معنیٰ ہے اور یہ کہ ذمہ داری سے فرار ایمان کی کمی کی علامت، دین میں خلل کا مظہر اور ایسا گناہ ہے جو توبہ وندامت کے بغیر دُھل نہیں سکتا۔

اس واقعہ سے یہ درس بھی ملتا ہے کہ عقیدہ قرابت سے بلند ہے اور اجتماعی نظام کی اطاعت ذاتی خواہشات و جذبات کی تقلید سے بالا ہے اور یہ کہ اللہ کے غضب اور اس کی ناراضگی سے قرابت اور رشتہ داری نہیں بچا سکتی:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝﴾ (سورة النور :٦٣)

''رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے۔''

حجۃ الوداع

بعثت کے بعد یہ پہلا اور آخری حج تھا جو آپ ﷺ نے ادا کیا۔ لوگوں کو جب اس اَمر کی اطلاع ملی کہ آپ ﷺ اس سال حج کریں گے تو جزیرۂ عرب کے مختلف گوشوں سے لوگ جَوق در جَوق پہنچنے لگے، یہاں تک کہ مؤرخین کے بقول یہ تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تک جا پہنچی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تعداد محض ظنّ و تخمین پر مبنی ہے ورنہ اتنی بڑی تعداد کا شمار کرنا ناممکن تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے یہیں وہ مشہور خطبہ دیا جس کا ایک ایک حرف ہر طالب علم کو یاد رہنا چاہیے کیونکہ اس میں اسلام کے عام اور ہمہ گیر اصول بیان ہوئے ہیں۔ یہ آپ ﷺ کا آخری خطبہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے لوگو، میری بات سنو، شاید اس سال کے بعد میں یہاں تمہیں نظر نہ آؤں۔ اے لوگو! تمہارا خون اور تمہارا مال اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ ہر جاہلی امر باطل ہے اور جاہلیّت کے تمام خون باطل کر دیئے گئے۔ اور سب سے پہلے میں ابن ربیعہ بن الحارث کا خون باطل کر دیتا ہوں جس نے بنی سعد میں پرورش پائی اور اس کو ہذیل نے قتل کر ڈالا، جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود، عباس (رضی اللہ عنہ) بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں، یہ سب کا سب باطل ہے، عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو، تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور ان کی شرمگاہوں کو اللہ کی بات کے ساتھ حلال سمجھا ہے اور تمہاری طرف سے یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو نہ آنے دیں، اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو ایسی مار مارو جو نمودار نہ ہو

اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ انہیں معقول طریقہ سے ان کی خوراک اور پوشاک مہیا کرو۔ میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں، اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے، وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ، تم سے اللہ کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا، تم کیا جواب دو گے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، ہم کہیں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا، اپنا فرض ادا کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی اُنگلی آسمان کی طرف اُٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا: ''اے اللہ! تو گواہ رہنا۔''

بعض روایتوں میں یہ اضافہ بھی ہے:

''ہاں میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ اور ہاں، شیطان بھی اِس سے مایوس ہو چکا ہے کہ نماز پڑھنے والے اس کی پرستش کریں، لیکن وہ تمہارے درمیان رخنہ اندازی کرے گا۔ آگاہ ہو جاؤ جس کے پاس کوئی امانت ہو وہ صاحبِ امانت کو واپس کر دے۔'' اتنا فرمانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور فرمایا کہ: ''کیا میں نے پیغام پہنچا دیا؟ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا؟'' پھر فرمایا: ''جو حاضر ہیں وہ غیر حاضر لوگوں تک یہ بات پہنچا دیں کیونکہ بہت سے غیر حاضر سُننے والوں سے زیادہ خوش بخت (وقوّی الحافظہ) ہوتے ہیں۔''

حجتہ الوداع کے اس رُوح پرور منظر کو پڑھ کر پہلا سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہزاروں کا مجمع جو جزیرۂ عرب کے گوشے گوشے سے سمٹ آیا تھا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر صدقِ دل سے ایمان لایا تھا، اور اس کی اطاعت میں خوشی اور راحت محسوس کرتا تھا، صرف تئیس سال پہلے شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھا، یہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا انکار کرتے تھے، توحید کی دعوت کو حیرت انگیز سمجھتے تھے، اپنے باپ دادا کے مذہب کو چھوڑنے

کے لیے تیار نہیں تھے، بلکہ ان کی اکثریت دُشمنی پر تلی ہوئی تھی، رسول ﷺ کو ہر طرح کی تکلیفیں پہنچانے پر مُصر تھی، آپ ﷺ کے قتل کی سازشیں کر رہی تھی، تلواروں اور نیزوں سے گھر کا گھیراؤ کر لیا تھا، آخر اس مختصر ترین مدّت میں اتنا عظیم الشّان انقلاب کیسے آ گیا، اور نبیٔ اکرم ﷺ نے اس عظیم مجمع کو شرک وبُت پرستی، جہالت و جاہلیّت اور انتشار و عداوت سے نکال کر توحیدِ باری تعالیٰ، سنتِ نبوی ﷺ، اتحاد و اتفاق اور ایک ہی مقصد و نصب العین کے گرد کیسے اکٹھا کر دیا؟ یہ لوگ جو دشمن تھے، لڑائی اور خانہ جنگی، سختی اور خشونت و درشتی میں مشہور تھے کیسے ان کے دلوں میں محبت اور پیار کی شمعیں فروزاں ہو گئیں؟ ایک انسان چاہے کتنا ہی تیز، ذکی، عبقری اور زبردست شخصیت کا حامل ہو، سینکڑوں سالوں میں بھی اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس طرح کا جیتا جاگتا مُعجزہ نہ قدیم تاریخ میں ملتا ہے نہ جدید تاریخ میں۔ یہ محض صداقتِ رسالت کی دین تھی، تائیدِ غیبی اور نصرتِ الٰہی کا کرشمہ تھا اور اس کامل و مکمّل اور ہمہ گیر دین کا کارنامہ تھا۔ جس کے ذریعہ اللہ نے بندوں پر اپنی نعمت کا اتمام کیا اور اپنا پیغام قیامت تک کے لیے نشر کر دیا۔ اس نے چاہا کہ اس دین کے ذریعہ اس اُمّت کو بدبختی سے نکالے جو زندگی کی پر پیچ راہوں میں بھٹک رہی تھی، اور مختلف عصبیّتوں اور خواہشات کا غلام تھی۔ اور اسے ہدایت کے راستے پر لائے، اس کی آنکھوں کو آفتاب کی شعاعوں کے سامنے کھولے قوموں کی قیادت اس کے ہاتھ میں دے، اس کے ذریعہ تاریخ کا دھارا موڑے۔ انسان کی ذلّت و رُسوائی کا خاتمہ کرے، اور اسے کتاب و حکمت کا ورثہ عطا کرے۔ ایک لاکھ چودہ ہزار انسان آپ ﷺ کی تکذیب کر رہے تھے، لیکن وہی بعد میں تصدیق و تائید کرنے لگے۔ پہلے وہی برسرِ جنگ اور رزم آراء تھے اب وہ مطیع و منقاد بن گئے۔ پہلے بغض و عداوت رکھتے تھے، اب پیار و محبت سے سرشار ہو گئے۔ پہلے سرکش و جبّار تھے، اب رحیم و کریم بن گئے۔ یہ سب کچھ تیئس سال کے مختصر عرصے میں ہو گیا۔ یہ محض اللہ بزرگ و برتر کا کرشمہ تھا۔

دوسری حقیقت جس کی طرف حجۃ الوداع کا یہ عظیم الشان خطبہ متوجہ کراتا ہے اور وہ مبادیٔ و اصول جن کا اس دن اعلان کیا گیا وہ جس چیز کی طرف ہماری نگاہوں کو موڑتے ہیں وہ یہ کہ یہ باقی و دائم اصول اور قواعد ہیں جن میں قلت و کثرت، صلح و جنگ، فتح وشکست، دُنیا کی دل چسپی یا بے توجہی، دُشمنوں کی طاقت اور ان کے ضعف سے کوئی فرق اور تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی۔ جبکہ ہم دُنیاوی لیڈروں کو دیکھتے ہیں کہ عقیدہ و مسلک اور اصول ونظریات ادلتے بدلتے رہتے ہیں، قوّت اور کمزوری دونوں حالتوں میں ان کا طریقہ کار بدل جاتا ہے، وسائل و مقاصد میں تبدیلی آتی رہتی ہے، جو کچھ دل میں رکھتے ہیں اس کے خلاف بیان دیتے ہیں اور جس چیز کا اعلان کرتے ہیں اس کے لیے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ کمزور ہوتے ہیں تو راہبوں کا بھیس بدل لیتے ہیں اور قوت پاتے ہیں تو بھیڑیوں کو شرما دیتے ہیں۔ یہ سب مفاد اور مصلحت کے پیغامبر ہوتے ہیں جبکہ اول الذکر اللہ کے پیغامبر ہوتے ہیں۔ کتنا فرق ہے اس میں جو سڑی ہوئی لاش پر منڈلاتا ہے اور اُس میں جو نور کے سمندر میں تیرتا ہے۔ کس قدر باہم مختلف ہیں وہ جو اپنے پیٹ کے لیے کام کرتے ہیں اور وہ جو انسانیت کے لیے کام کرتے ہیں! شیطان کے اولیاء اور رحمٰن کے اولیاء میں کتنا عظیم تفاوت ہے!

﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ ﴾ (سورۃ البقرہ: ۲۵۷)

’’جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لیتا ہے۔ اور وہ لوگ جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔‘‘

جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کی تیاری

دعوت کی نشر اشاعت کے لیے اور اس نئی مملکت پر چڑھائی کرنے والوں کے حملوں کو ناکام بنانے کے لیے آخری کام جو آپ ﷺ نے انجام دیا وہ جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کی تیاری تھی۔ آپ ﷺ نے اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کا اَمیر بنا کے بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ ان کے گھوڑے بلقاء اور داروم کی سرزمین تک ضرور جائیں جو ارضِ فلسطین کا حصّہ ہے۔ اس لشکر میں تمام مہاجرین و انصار اور مدینہ کے پڑوس میں رہنے والے مسلمان تھے۔ اُدھر لشکر مدینہ کے باہر روانگی کی تیاری کر رہا تھا، اُدھر رسول اللہ ﷺ کی طبیعت سخت علیل ہوگئی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی شفایابی کے انتظار میں رُک گیا۔

لیکن اللہ کے رسول ﷺ چند دنوں کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انہیں اللہ نے اپنے جوارِ رحمت میں بلا لیا کیونکہ آپ ﷺ امانت پہنچا چکے تھے، کارِ رسالت کی تکمیل کر چکے تھے اور پورے جزیرہ عرب کو اسلام کا پرچم سربلند کرنے کے لیے اور پورے رُوئے زمین پر اس کی تعلیمات و تہذیب کو عام کرنے کے لیے تیار فرما چکے تھے۔ وہ فوج تیار ہو چکی تھی جو اس عظیم امانت کو اٹھا سکتی اور ان معرکہ آرائیوں میں حصّہ لینے کے لیے اس کے نیک بندے تربیت پا چکے تھے، جنگوں کی قیادت کے لیے بہترین قائد اور کمانڈوز فراہم ہو چکے تھے اور مملکت کا انتظام چلانے کے لیے نیک اور صالح افراد کی کھیپ میدان میں آ چکی تھی، اس لیے اللہ نے آپ ﷺ کو بلا لیا۔ آپ ﷺ پر ہزاروں بار دَرود وسلام ہو اور ہماری طرف سے پوری انسانیت کی طرف سے آپ ﷺ کو اللہ جزائے خیر دے کیونکہ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے اور آپ ﷺ کی مخلص اور وفادار فوج نہ ہوتی تو ہم آج کھلی ہوئی گمراہی میں ہوتے۔

اللہ نے آپ ﷺ کو جس اعزاز سے نوازا اس سے قبل کسی نبی علیہ السلام کو یہ اعزاز عطا نہ ہوا تھا...... آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اتنے طویل عرصہ تک باقی رہی کہ آپ ﷺ نے اپنی

آنکھوں سے دیکھ لیا کہ یہ دعوت پورے جزیرہ عرب پر حاوی ہو چکی ہے، اسے بُت پرستی سے ہمیشہ کے لیے پاک کر رہی ہے اور جن لوگوں نے ان پتھر کے بتوں کو پاش پاش کیا وہ اس نجات اور نعمتِ الٰہی پر شاداں و فرحاں ہیں۔ یہی لوگ پہلے ان معبودانِ باطلہ کی پرستش کرتے تھے، اپنی جبین نیاز ان کے آگے جُھکاتے اور ان کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

پھر آپ ﷺ نے دیکھ لیا کہ یہ دعوت اور تحریک مسلمانوں کو اس قابل بنا چکی ہے کہ وہ پورے رُوئے زمین پر اللہ کے کلمہ کو لے کر پھیل جائیں، لوگوں تک اس ہدایت کی روشنی پہنچا دیں جس سے اللہ نے انہیں سرفراز کیا ہے۔ یہی وہ نسلِ واحد تھی جو اصنام کی عبادت کرتی اور اسے اپنے الٰہ بنائے ہوئے تھی اور تمام صلاحیتوں اور طریقوں کو پژمردہ رکھ کر زندگی بسر کر رہی تھی، پھر اسی نے بُتوں کو چکنا چور کیا اور پورے عرب کی تاریخ میں پہلی ایسی عربی مملکت قائم کی جو ایک پیغام اور ایک نصبُ العین کی علمبردار تھی اور دُنیا کی تمام قوموں کے لیے معلّم اور نجات دہندہ کی حیثیت رکھتی تھی، ہدایت و روشنی کی ہراول دستہ تھی اور قومیں جس جہالت و جاہلیّت اور تاریکی و انارکی میں لت پت تھیں، ان سے نکالنے کے لیے وہ بے چین اور مضطرب تھی، جبکہ عرب اسلام سے پہلے انہی چیزوں کو کبر و فخر اور عظمت و حشمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور فکری و اجتماعی اور سیاسی ماتحتی کا موقف اختیار کیئے ہوئے تھے۔ قدیم و جدید تاریخ میں یہ انقلاب منفرد اور ممتاز ہے اور لشکرِ اُسامہ رضی اللہ عنہ اس انقلاب کا عنوان اور اس مبارک پیغام کے نتائج کا آغاز تھا۔

رسولِ اکرم ﷺ نے اس لشکر کی قیادت کے لیے اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا، حالانکہ وہ بیس سال کے کم سن اور نوخیز لڑکے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کے پرچم تلے مہاجرین اور انصار کے اکابر جیسے ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم وغیرہ موجود تھے جو اسلام لانے میں بھی ان سے آگے تھے، ان کے کارنامے بھی بیش تھے اور مقام و مرتبہ اور سن و سال میں بھی بڑے

تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا۔ یہ اسلام کی ایک محبوب سُنّت اور اس کا بنیادی قانون ہے، یہاں جاہ و رتبہ، سنّ و سال اور فضل و اکرام کے سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور صالحیّت وصلاحیّت معیار قرار پاتی ہے چاہے عمر کتنی ہی کم ہو۔ پھر ان بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کا امارتِ اُسامہ رضی اللہ عنہ پر راضی ہو جانا، جن کی عظمت و صلاحیّت اور شرافت ونجابت کی مثال تاریخ کو کہیں نظر نہ آئی۔ اس نفسی تربیت اور اخلاقی کردار کا پتہ دیتی ہے جو رسول ﷺ کے رحم و احسان، ہدایت وتربیّت اور ارشاد و اصلاح کی بدولت ان بزرگوں میں پیدا ہو گیا تھا۔

امارتِ اُسامہ رضی اللہ عنہ ایک ایسا تاریخی ریکارڈ ہے جو کسی قوم اور اُمت میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانوں کی صلاحیت اور عبقریت کے لیے میدان وسیع ہونا چاہیے اور انہیں معاملات کی قیادت سونپی جانی چاہیے تاکہ وہ اس کے لائق اور موزوں ہوسکیں۔ یہ ایک بہت بڑا درس تھا جسے مسلمان اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں یاد رکھتے تو بہت سے حادثات اور المیے ظہور میں نہ آتے۔

وہ فتنے اور آندھیاں نہ اُٹھتیں، جنہوں نے سلطنتِ اسلامی کے ستون زمین بوس کر دیئے اور اس کی قوت کو کمزور کر کے رکھ دیا۔ رسولِ اکرم ﷺ جو وحی آسمانی کی تائید سے سرفراز تھے، اُس حکمت، دانش اور راستی و دُور اندیشی سے نوازے گئے تھے جو اس سے پہلے کسی نبی علیہ السلام کو میسر نہ تھیں، اور نہ آپ ﷺ کے بعد اور پہلے تاریخ نے اتنا عظیم انسان دیکھا، یہ شاندار کارنامہ انجام دے کر قیامت تک کے انسانوں کے لیے نمونہ چھوڑ گئے۔ اللہ راضی ہو، نوجوان اسامہ رضی اللہ عنہ سے اور ان کی قائدانہ صلاحیّت، عزمِ محکم اور حسنِ اسلام پر رسول اللہ ﷺ کا اعتماد انہیں مبارک ہو۔ اللہ انہیں خوش رکھے اور نوجوان مسلمانوں کے لیے ان کی زندگی کو اُسوہ بنائے۔

وفاتِ رسول اللہ ﷺ

اللہ کے رسول ﷺ کی وفات سے پہلے وحی کے ذریعے وفات کے قرت کی اطلاع مل چکی تھی چنانچہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں لوگوں کو الوداع کہا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل خوف وخشیّت سے کانپ رہے تھے۔ مبادا اجلِ مسمّٰی قریب آ لگی ہو، لیکن یہ مدّتِ حیات جب ختم ہوتی ہے تو ٹالے نہیں ٹلتی، چنانچہ جب وفاتِ رسول ﷺ کی خبر عام ہوئی تو اس ہولناک حادثہ سے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم بے چین اور مضطرب ہو گئے، مدینہ میں زلزلہ آ گیا اور سابقون الاوّلون اور کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی، کسی کی زبان گنگ ہوگئی، کوئی حرکت اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جوش میں تلوار نکال لی کہ جس نے کہا کہ محمد ﷺ مر چکے ہیں، اس کا سر قلم کر دوں گا۔ لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تنہا وہ فرد تھے جن کے حواس سلامت تھے، وہ فوراً رسول اللہ ﷺ کے جسمِ مبارک کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ آپ ﷺ پر چادر پڑی ہوئی ہے، ذرا سی چادر سرکائی اور رُوئے مبارک کا بوسہ لیا اور کہا:

''میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، موت کا مزہ جو اللہ نے آپ ﷺ کے لیے مقدر کر دیا تھا آپ ﷺ نے چکھ لیا۔ آپ ﷺ کو اب کبھی بھی موت کی تکلیف نہ ہوگی۔'' [1]

پھر عوام کی طرف آئے اور تقریر شروع کی:

''لوگو! اگر کوئی محمد (ﷺ) کی عبادت کرتا تھا تو اس کو معلوم ہو جائے کہ بلاشبہ ان کی وفات ہوگئی اور اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو وہ زندہ ہے، اس کے لیے موت نہیں ہے۔''

---

[1] صحیح بخاری عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ الفتح الربانی: ۲۱/ ۲۵۰

پھر یہ آیت تلاوت کی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾ (سورة آل عمران:١٤٤)

''محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو جو الٹے پاؤں پھرے گا، وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے، انہیں وہ ان کی جزا دے گا۔''

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی تو لوگ صدمہ کے خول سے جاگے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انہوں نے یہ آیت پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو تلاوت کرتے سنا تو حیرت زدہ ہو کر بے ساختہ زمین پر گر گیا، میرے پاؤں کی طاقت ختم ہو چکی تھی، اس وقت گویا مجھے یہ یقین ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں۔ [1]

اس واقعہ سے دو اہم سبق ملتے ہیں:

پہلا سبق:

صحابہ رضی اللہ عنہم وفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متحیّر رہ گئے گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو موت آنی ہی نہ تھی، حالانکہ موت کا مزہ ہر جاندار کو چکھنا ہے۔ یہ تحیّر اور دہشت محض اس محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تھی جو ان کے خون اور رگوں میں دَوڑ چکی تھی۔ احباب کے کھونے کا صدمہ محبت کے بقدر ہوتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کے والد یا بچے کا انتقال ہو جائے تو چند دنوں تک اسے اس پر یقین نہیں آتا، پھر بھلا دنیا کی یہ محبت صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ کر

[1] صحیح بخاری :٢/ ٦٤٠-٦٤١.

سکتی ہے، جبکہ آپ ﷺ کے ذریعے انہیں ہدایت ملی تھی،آپ ﷺ ہی کے واسطے سے تاریکیوں سے نکل کر روشنیوں میں آئے تھے،زندگیاں تبدیل ہوئی تھیں،عقل ونظر کو روشنی عطا ہوئی تھی اور آپ ﷺ کے ذریعے وہ قیادت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے تھے۔پھر آپ ﷺ اپنی زندگی میں ان کے مُربّی ،قاضی،اور مُرشد تھے،مصیبتوں اور حوادث میں آپ ﷺ ہی کی طرف وہ رجوع کرتے تھے ،آپ ﷺ ہی سے اللہ کا کلام اور اس کی تعلیمات اَخذ کرتے تھے۔جب آپ ﷺ کا انتقال ہوگیا تو یہ ساری فیض رسانیاں منقطع ہوگئیں۔بھلا اس صدمہ سے زیادہ شدید اور ہولناک اور کون سا صدمہ ہوسکتا ہے؟

دوسرا سبق:

ابو بکر رضی اللہ عنہ کا موقف بتا تا ہے کہ مصیبتوں اور حوادث کے موقع پر آپ رضی اللہ عنہ جس عزمِ محکم،قوتِ فیصلہ اور دل جمعی سے مالا مال تھے،وہ کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کے حصّے میں نہ آئی تھی،یہ چیز آپ رضی اللہ عنہ کو خلافت کا اوّلین مستحق ثابت کرتی ہے اور معرکۂ ارتداد میں آپ رضی اللہ عنہ کی اس صفت اور قابلیّت کا اظہار نمایاں ہوا۔

نوٹ: ...... یہاں تک ان لیکچرز کا خلاصہ ہے جو میں نے سیکنڈ ائیر (second year) کے طلبہ کو دیئے تھے۔ان لیکچروں کے نتائج پر مشتمل چار فصلیں باقی رہ جاتی ہیں اور وقت اجازت نہیں دیتا کہ بقیہ فصلوں کی املا کرائی جا سکے جیسا کہ ہم مقدّمہ میں کہہ چکے ہیں۔اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس طریقہ کے مطابق بقیہ حصّوں کی تحریر وتصنیف کا موقع بھی وہ عنایت کرے گا۔اِنْ شَاءَ اللّٰه۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ